243 | Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1978

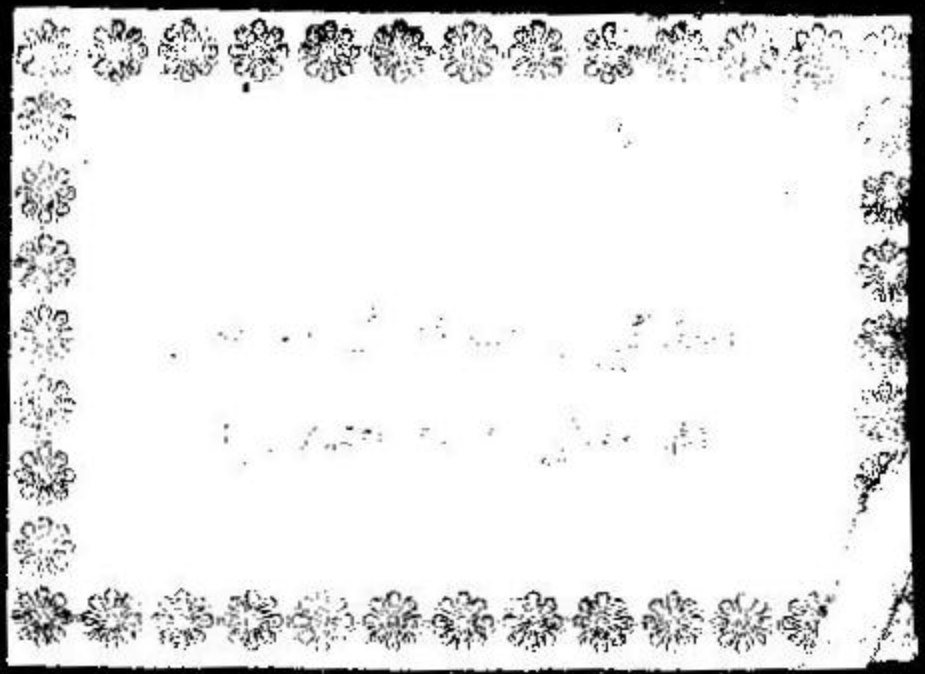

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون نمبر
۸۸۰۸۰۰

خط وکتابت

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۲۴ روپے
غیر ممالک ——— ۳ پونڈ

قیمت فی پرچہ
۲
دو روپے

جلد ۳۱ | ستمبر ۱۹۷۸ء | شمارہ ۹

فہرست

۱- لمعات ——— ۲

کس نباشد درجہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است وبس

۲- کوڑوں کی وضاحت :- ——— ۹
(۱) فقہی تحقیق۔
(۲) عینی شاہد کی روئداد

۳- حقائق وعبر: ——— ۱۲
(۱) احکامِ شریعت میں تبدیلی!
(۲) یہ کس قرآن میں ہے؟
(۳) جرائم کی پردہ پوشی۔
(۴) اندر کی باتیں باہر آرہی ہیں!

۴- یومِ آزادی کی تقریب ——— ۱۵

۵- قرآنی قوانین ——— ۱۵

۶- شہدائے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یادیں ——— ۱۷
——— (محترم پرویز صاحب)
(۱) شہر کے لوگ۔ "
(۲) ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے (۱) "
(۳) " " " " " (۲) "
(۴) پاکستان کی نئی زیارت گاہیں (۱) "
(۵) " " " " (۲) "
(۶) میں نے چھمب اور جوڑیاں میں کیا دیکھا؟
——— (سلمٰی پرویز)

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۷ اسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

لمعات

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

ہم نے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۷ء میں حسبِ ذیل لمعات لکھے تھے:۔
گذشتہ اپریل، اخبارات میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی:۔

اوکاڑہ کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ یہاں ملٹری ڈیری فارم کے ایک مزدور اسماعیل نے بھوک اور غربت سے تنگ آکر اپنے تین بچوں کو نہر میں ڈبو کر ہلاک کر دیا۔ اس افسوسناک واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ ۹ اپریل کو جب اسماعیل کو ۵۵ روپے تنخواہ ملی تو لوگوں کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس کی ساری پونجی ختم ہوگئی اور وہ یہ سوچنے لگا کہ گھر اور بچوں کی ضروریات کیسے پوری کروں۔ پریشانی اور مایوسی کے اسی عالم میں وہ جب گھر پہنچا تو وہاں بچے بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ باپ سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ اس نے چاروں بچوں کو سائیکل پر بٹھایا اور نہر پر لے گیا۔ وہاں بچوں کو یہ دلاسا دیا کہ تم نہاؤ اور میں تمہارے لئے مٹھائی اور نئے کپڑے لے کر آتا ہوں۔ بچے جب نہانے لگے تو باپ نے تین بچوں کو ڈبو دیا۔ مگر آٹھ سالہ بچہ باپ سے لپٹ گیا اور اس نے گھر پہنچ کر اپنی ماں کو یہ سارا واقعہ بتایا۔ گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ پولیس نے اطلاع ملنے پر ملزم کو گرفتار کر لیا۔ غرق شدہ تین بچوں کی عمر دس (۱۰) سال، سات (۷) سال۔ اور پانچ سال تھی۔ (بحوالہ اعتصام۔ بابت ۳ مئی ۱۹۵۷ء)

مارچ ۱۹۵۵ء میں کراچی میں ایک نوجوان نے اسی قسم کے حالات سے مجبور ہو کر، اسٹیٹ بینک کی دیوار کے ساتھ ٹکر مار کر خودکشی کی کوشش کی تھی جس پر اسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا:۔

نہ یہ خبر انوکھی ہے اور نہ یہ واقعہ غیر معمولی —— قریب قریب ہر روز، اور ہر شہر میں اس قسم کے واقعات ہوتے اور اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم نے جس مقصد کے لئے اسے

اطمینان بخش علاج اپنے اندر نہیں رکھتا تو سمجھ لیجئے کہ اسے اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں ۔۔

اسلام کے متعلق ہمارا دعوٰی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا واحد اور مکمل حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر وہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا اطمینان بخش حل نہیں پیش کر سکتا تو ہمارا یہ دعوٰی کبھی سچا نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لئے قرآن نے اس نظام کو پیش کیا ہے جس کی رُو سے مملکت میں بسنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوتی ہے۔

کیا پاکستان کے لئے نیا دستور مرتب کرنے والے اس اہم حقیقت کو اپنے سامنے رکھیں گے؟

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے ۱۳ اگست کا روزنامہ تسنیم آیا جو جماعت اسلامی کا ترجمان ہے اس میں مندرجہ صدر واقعہ کے متعلق ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے۔ اس خط میں وہ (اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد) پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ:-

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی وارداتیں کافی ہوتی رہتی ہیں۔ اخبارات انہیں نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ بعض معاصر نے "غریب کی قدیم کہانی" کا نام دے کر اس میں اپنے مخصوص مقاصد کے تحت پُرفریب مستقبل اور وعدوں اور امیدوں کا وہ رنگ بھرنا شروع کر دیا ہے کہ جب ذرائع دولت اجتماعی قبضہ میں ہوں گے تو اس کو خزانہ کرنے کے بجائے اسے غرباء کے مصرف میں اس طرح سے دے دیا جائے گا جس سے انسان کے لئے دنیا جنت بن جائے گی۔

اس کے بعد وہ یہ فرماتے ہیں کہ اسلام نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

اس موضوع پر اسلامی تعلیمات میں کچھ ابہام نہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ دین مبین میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کے مرتکب کے لئے وعید وارد ہے کہ وہ عالم برزخ میں اور حشر کے بعد اسی عذاب میں مبتلا رہے گا جس میں اس نے غلطی سے مداوا سمجھ کر اپنے آپ کو مبتلا کر لیا تھا۔ زہر کھانے والا بار بار زہر کھائے گا اور مر مر کے جیئے گا۔ خنجر سے کام تمام کرنے والا برچھی گھونپتا پھرے گا۔ اور پھندا لگانے والا پھانسی ہی پاتا رہے گا۔ گویا جان، جان آفریں کی ہے جس نے دی ہے اس کا کام ہے کہ وہ اسے واپس بھی لے۔ دیگر فرائض کی طرح اس کی حفاظت کرنا بھی خدا اور نفس کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والے حقوق کی طرح ایک فرض ہے۔ افسوس اس بات پر آتا ہے کہ باوجود ذرا ظاہر حکم اور فیصلہ موجود ہونے کے ہم نے اس کی تبلیغ میں مجرمانہ غفلت کی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے خطیبوں اور واعظوں کے خطبوں اور وعظوں میں کتابی مسائل کے لچھے کے لچھے پھیلتے جائیں گے۔ دور از کار قصے۔ کرامات اور معجزات کو شعر خوانی کی چاشنی سے ہم مزے لے لے کر منبروں سے نشر کریں گے لیکن حالاتِ حاضرہ پر کچھ فقرات پیدا کرنے سے ہماری گویائی عاجز اور عملی زندگی کی خرابیوں کا تصور پیدا کر لینے اور ان سے عوام کو باز رکھنے کا مؤثر اسلوب اختراع کرنے میں ہماری تخیل سقیم ہو کر رہ گئی ہے۔

آپ نے علاج ملاحظہ فرما لیا۔ یعنی معاشرہ پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دے

جس سے تنگ آکر فاقہ کش، نادار بیمار، خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خودکشی ایک جرم ہے لیکن جس اسلام نے ایک فاقہ کش کو اضطراری حالت میں حرام تک کھا لینے کی اجازت دی ہے۔ اس سے ہی ایک ایسے نادار کے لئے جس کے پاس نہ پیٹ بھر کر کھانے کے لئے روٹی ہو، نہ اپنی بیماری کے علاج کے لئے پیسہ اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ اس غریب سے وعظ کہے جائیں لیکن جو اس کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں انہیں اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جس قدر جی چاہے دولت سمیٹتے چلے جائیں بشرطیکہ وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال کر ان فتویٰ دینے والوں کی مفت خوری کا انتظام کرتے رہیں!

یاد رکھئے! یہی ہے ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ اسلام جو دنیا میں کمیونزم کے جہنم کو اس تیزی سے بڑھاتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے شعلوں کی لپیٹ سے کوئی فضا بھی محفوظ نظر نہیں آتی۔ اگر پاکستان میں اس قسم کے ارباب شریعت کا تجویز کردہ اسلامی دستور نافذ ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ اس کے دروازے کمیونزم کے جہنم کے لئے چوپٹ کھل جائیں گے اور اس وقت (عام مسلمانوں پر تو جو بیتے گی، بیتے ہی گی) خود وہ تمام قوتیں جو آج کمیونزم کی روک تھام کے لئے اس قدر روپیہ صرف کر رہی ہیں دانتوں میں انگلی دبائے بصد حسرت و یاس کہہ رہی ہوں گی کہ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا۔ (۹۰/۶) ہم نے اتنی دولت ناحق ضائع کی!

(طلوعِ اسلام ۔ دسمبر ۵۵ء ۔ ص ۲۰)

پاکستان کا دستور مرتب ہو گیا۔ اس پر حکومت نے چراغاں کیا اور ملک کی تمام مذہبی جماعتوں، اور علمائے کرام نے اسے اسلامی دستور قرار دے کر مجلس آئین ساز کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ یعنی اس دستور کے مرتب کرنے پر جس میں مفلسوں اور فاقہ کشوں کی مصیبتوں کا حل موجود نہیں۔

———— (٭) ————

اس کے بعد ہم نے مارچ سنہ ۱۹۶۴ء کے "حقائق و عبر" میں ——— باچشمِ نم ——— کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع کیا:-

روزنامہ مشرق (لاہور) بابت ۷ رفروری سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع شدہ ایک خبر:-

گزشتہ شب چشتیاں کی گیارہ سالہ بچی بلقیس بیگم میو ہسپتال میں انتقال کر گئی۔ پانچ روز قبل اس کی معمر والدہ فضل بی بی اور اس کا بھائی بشیر نہایت کس مپرسی کی حالت میں اسے لے کر لاہور پہنچے تھے۔ اور ایک تانگے والا ان کا وہ صندوق لے کر فرار ہو گیا، جس میں فضل بی بی کے بیان کے مطابق ضروری کپڑوں کے علاوہ بچی کا کفن بھی رکھا تھا ——

فضل بی بی نے نمائندہ مشرق کو بتایا کہ ہسپتال میں بلقیس تو داخل ہو گئی مگر اس کے ساتھ مجھے نہیں رہنے دیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں دو دن تک بچی کی شکل دیکھنے سے محروم رہی اور ہسپتال کے گیٹ پر پڑی ہر آنے جانے والے کا منہ دیکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے سنا تھا کہ لاہور میں اہل دل حضرات کی کمی نہیں مگر میری مصیبت میں کسی نے میری حوصلہ افزائی نہ کی۔ اور میری بچی کا کفن تک چھین لیا ——— مرحومہ بلقیس بیگم کے بھائی بشیر نے

بتایا کہ اخبار میں ہماری داستان سُن کر ایک صاحب نے مجھے سات روپے دیئے۔ جو میں نے قرض حسنہ سمجھ کر قبول کر لئے۔ اس نے کہا کہ لاہور میں ہمارا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ والدہ کے لئے کھانے پینے اور بیمار بہن کی ضروریات کا انتظام کرنا بہرحال میرے ذمہ تھا جس کی تکمیل کے لئے میں نے دو دن تک لاہور میں مزدوری کی تلاش کی اور مارا مارا پھرا مگر کسی نے بھی مجھے مزدوری نہ دی اور میری والدہ دو دن تک فاقوں کا شکار رہی اور میں نے لنڈے بازار میں اپنے جوتے اور پگڑی فروخت کی اور والدہ اور اپنے لئے روٹی کا انتظام کیا۔

اس کے بعد خبر میں کہا گیا ہے کہ دوسرے دن اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لاہور میں ہوا جس میں خیر سے اس رسول ؐ کے لاکھوں نام لیوا بستے ہیں جس نے فرمایا تھا کہ:۔

جس بستی میں ایک فرد نے رات بھوکے بسر کی اس بستی کی حفاظت کی ذمہ داری خدا کے ہاں سے ختم ہو جاتی ہے۔

اور یہ اس رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا جس میں ایک ایک مسجد میں ختم قرآن کریم پر ہزاروں روپے تزئین و آرائش پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اولئک حبطت اعمالھم کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

---(o)---

پھر ہم نے "مجرم کون ہے؟" کے عنوان سے نومبر ۱۹۶۴ء کے حقائق و عبر میں لکھا:۔

۲۷ اگست ۱۹۶۴ء کے روزنامہ مشرق (لاہور) میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

ماں سے سولہ دن کی بچی کا بھوک سے تڑپنا نہ دیکھا گیا اور وہ دیوانوں کی طرح بچی کو لے کر گھر سے باہر نکل آئی۔ اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی۔ ماں کی اس حرکت سے بچی کی بھوک تو ختم نہ ہو سکی۔ البتہ اس کی زندگی کا (۱۷) واں دن حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گزرا۔

حشمت بی بی نے بتایا کہ پانچ سال قبل اس کی شادی ملتان روڈ کے ایک نوجوان مسکین سے ہوئی۔ تین سال تک دونوں میاں بیوی بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ چند ماہ پہلے اچانک اس کا شوہر بیمار ہو گیا اور اس کی بیماری طول پکڑتی چلی گئی۔ حشمت بی بی نے شوہر کا علاج کرنے کے لئے اپنی تمام پونجی لٹادی۔ لیکن وہ صحت یاب نہ ہوا۔ آخر اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب حشمت بی بی پر گھر کے اخراجات کا بوجھ بھی آپڑا اور اس نے محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاوند کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔

سولہ روز قبل حشمت بی بی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اس طرح اس کی مزدوری بھی چھوٹ گئی۔

حشمت بی بی نے کہا وہ گذشتہ چار دنوں سے بھوکی تھی۔ اور اس فاقہ نے اس کی سولہ دن کی بچی کو بھی نڈھال کر دیا۔ میں نے بچی کی حالت نہ دیکھی گئی اور وہ اسے لے کر دودھ کی

تلاش میں گھر سے باہر نکل آئی حشمت بی بی نے کہا کہ اس نے کئی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا لیکن کسی نے اس کی داد رسی نہ کی۔ آخر اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنا چاہا تو پولیس نے اسے پکڑا۔ اور حوالات میں بند کر دیا۔

ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد اس خاتون پر کیا گزری اور وہ اب کہاں ہے۔ نہ ہی ہم نے مزید تحقیق کے لئے اس خبر کو اپنے ہاں شائع کیا۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بے شک پولیس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز کو زبردستی چھینتا ہے تو اسے حراست میں لے لے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں کہ جو بھی اس طرح بلک بلک کر بھوک سے جان دے رہی ہو اس کے لئے سامانِ زیست مہیا کیا جائے!

ہمارے موجودہ معاشرہ میں تو یہ کسی کی بھی ذمہ داری نہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہاں ایسے مخیّر افراد موجود نہیں؟ ——— یہ بات افراد کے بس کی ہے نہیں۔ یہ ذمہ داری وہ معاشرہ اپنے سر لیتا ہے جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے ——— یہ تمام خرابیاں اس معاشرہ کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔

———(o)———

یہ پندرہ بیس سال اُدھر کے واقعات ہیں۔ اب حال ہی ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے جو نوائے وقت (لاہور) کی ۲۴ جولائی ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے:۔

سوہا بازار کی گوجر گلی کے ایک بیس سالہ نوجوان شفیق الرحمٰن نے آج تمام ملازمت نہ ملنے سے دل برداشتہ ہو کر مینارِ پاکستان سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ بادامی باغ پولیس نے نعش قبضے میں لے کر اسے پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شفیق الرحمٰن نے چار سال قبل میٹرک کیا تھا۔ گھریلو حالات خراب ہونے کے سبب وہ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ملازمت کی تلاش شروع کر دی، مگر ناکام رہا۔ بعد ازاں اس نے بیڑیوں کا کام شروع کیا مگر چند ہفتوں کے بعد چھوڑ دیا، اور ملازمت کی تلاش دوبارہ شروع کر دی۔ شفیق الرحمٰن کا والد بنک میں ملازم ہے اور اس کی تنخواہ میں بمشکل گھر کا خرچ چلتا۔ ملازمت کے حصول میں ناکامی اور گھر کے حالات سے شفیق اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ اس نے آج مینارِ پاکستان سے کود کر خودکشی کر لی۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے دو خط لکھے۔ ایک خط اس نے اپنی ماں کے پاندان میں اور دوسرا اپنی جیب میں رکھ لیا۔

متوفی کے ورثاء نے بتایا کہ شفیق کو گھر سے نکلے ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اس کی والدہ کو پاندان سے اس کا خط مل گیا جس کو دیکھ کر گھر والے مینارِ پاکستان کی طرف بھاگے مگر اس وقت تک شفیق الرحمٰن خودکشی کر چکا تھا۔ خط میں متوفی نے اپنی بوڑھی والدہ

کو لکھا ہے کہ میں ملازمت میں ناکامی کے باعث مینارِ پاکستان سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر رہا ہوں اس لئے وہ غم نہ کرے۔ پولیس نے متوفی کے دونوں خط قبضے میں لے لئے ہیں۔

اس خبر کے شائع ہونے کے بعد ہم منتظر تھے کہ اور نہیں تو "داعیانِ" "نظامِ مصطفےٰ" کی طرف سے اس پر کیا تبصرہ شائع ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت تک ہماری نظروں سے نہ ان کی طرف سے نہ کسی اور گوشے کی طرف سے اس کے متعلق ایک حرف تک بھی نہ دیکھنے میں آیا نہ سننے میں۔ ظاہر ہے کہ "نظامِ مصطفےٰ" کے نعروں کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محراب و منبر سے اس قسم کے تاریخی واقعات پیش کر کے کہ:-

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی"

عوام کی تائید حاصل کر لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے قرآن کے معاشی نظام کا کمیونزم کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

آں خدا نانے دہد، جانے دہد!
ایں خدا نانے دہد، جانے برد

یعنی قرآن کا خدا روٹی بھی دیتا ہے اور جان بھی ——— کمیونزم کا "خدا" روٹی تو دیتا ہے لیکن جان نکال کر لے جاتا ہے ——— لیکن وہ ایک تیسرے "خدا" کا ذکر کرنا بھول گئے۔ جو روٹی بھی نہیں دیتا، اور جان نکال کر لے جاتا ہے۔ قرآن، باطل کے ان دونوں "خداؤں" کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔

(۰)

ایک ضروری تصحیح

قرآنی قوانین ——— صفحہ ۸۵ ——— سطر ۱۱ ———

(غلط) ——— ان کی اس کمی کو پورا نہ کرو۔

(صحیح) ——— ان کی اس کمی کو پورا کرو۔

——— اس کتاب کے قارئین اگر اس میں کتابت کی کوئی اور غلطی پائیں تو ہمیں اس سے مطلع فرمائیں۔ اس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہوں گے۔ ———

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

کوڑوں کی وضاحت

طلوعِ اسلام بابت اگست ۷۸ء میں ہم نے کہا تھا کہ اگر کوئی صاحب بتا دیں کہ سعودی عرب وغیرہ میں مجرموں کو جن کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے وہ کس قسم کے ہوتے ہیں، تو ہم اُن کے شکر گذار ہوں گے۔ ہمارے اس سوال کے جواب میں محترم رفیع اللہ شہاب نے ایک مختصر سے شذرہ میں ہمیں اپنی اس تحقیق سے نوازا ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے کوڑوں کی نوعیت کیا ہے۔ اور قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے اپنا عینی مشاہدہ تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ فقہی تحقیق

قرآن مجید میں کوڑے کے لئے "جلدۃ" کا لفظ آیا ہے۔ جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجرم کو کسی ایسی چیز سے سزا دی جائے جس کا اثر صرف اس کی کھال تک محدود رہے۔ اسلامی فقہ کی تفصیلات کے مطابق اگر کوڑے لگانے سے مجرم کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا یا کھال پھٹ گئی، یا زخم کھال کے اندر تک پہنچ گیا تو ایسی سزا جائز نہیں ہوتی۔ چنانچہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن سے اس قسم کے زخم وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔

دورِ نبویؐ میں تو جرائم کی تعداد بڑی محدود تھی اور شاذ و نادر ہی کوڑوں کی سزا تک نوبت پہنچتی تھی۔ اس لئے اِس دور میں کوئی مخصوص قسم کا کوڑا تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا تو اُسے جوتوں یا کھجور کی چھال سے سزا دی جاتی۔ قاضی ابوبکر جصاص دورِ نبویؐ کی سزا کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

کان من ضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالجرید والنعال۔

(احکام القرآن - جلد سوم - صفحہ ۲۶۰)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوڑے مارنے کا کام جوتوں یا کھجور کی چھال سے لیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ دورِ نبویؐ میں چمڑے سے بنے ہوئے کوڑے سے سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ یہی صورتِ حالات حضرت ابوبکرؓ کے دور میں رہی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس مقصد کے لئے مخصوص کوڑا تیار کرایا تھا

جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:۔

اتی عمر بسوط فیہ شدۃ فقال ارید الین من ھذا۔ فاتی بسوۃ فیہ لین ۔ فقال ارید اشد من ھذا۔ فاتی بسوۃ بین السوطین۔ فقال اضرب۔ ولا یری ابطلک واعط کل عضو حقہ۔

(ایضاً۔ صفحہ ۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک کوڑا لایا گیا جو بہت سخت تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اس سے ذرا نرم ہونا چاہیئے۔ اس پر آپ کے پاس دوسرا کوڑا لایا گیا۔ جو پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے ذرا سخت چاہیئے۔ چنانچہ آپ کے پاس ان دونوں کوڑوں کے درمیانی معیار کا کوڑا لایا گیا تو آپ نے مارنے والے سے فرمایا کہ اس سے اس طرح ضرب لگائی جائے کہ تیری بغل (ARM PIT) نظر نہ آئے۔ اور پھر یہ کہ یہ کوڑے جسم کے ہر حصے پر لگائے جائیں۔

خیال رہے کہ کوڑوں کی سزا دہ اہل علم صحابہؓ دیتے تھے جنہیں شرعی احکامات و اصول کا پورا پورا علم ہوتا تھا۔ اور پھر یہ کہ یہ سزا کپڑے اتار کر نہیں بلکہ موسم کے مطابق مجرم نے جو کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے ان کو اتارے بغیر دی جاتی تھی۔ بلکہ اگر کوئی مجرم خود بھی کپڑے اتارنا چاہتا تو اسے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح سے روایت ہے:۔

ان ابا عبیدۃ بن الجراح اتی برجل فی حد مذھب الرجل ینزع قمیصہ وقال ینبغی لجسدی ھذا المذنب ان یضرب ولیس علیہ قمیص۔ فقال ابو عبیدۃ لاتدعوہ تنزع قمیصہ فضربہ علیہ

(ایضاً۔ صفحہ ۲۶۲)

حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کے پاس شرعی سزا کا ایک مجرم لایا گیا۔ تو اس نے اپنی قمیض اتارنی شروع کر دی۔ اور کہنے لگا کہ اس گناہگار جسم کو اس حالت میں کوڑے پڑنے چاہیئے کہ اس پر قمیص نہ ہو۔ لیکن حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا کہ اسے قمیص نہ اتارنے دو۔ پس اسے قمیص کے اوپر کوڑے مارے گئے۔

یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جلد کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے مجرم کو بھیڑ یا بکری کی کھال پہنا دی جاتی تھی۔ تاکہ کوڑوں کا اثر جلد کے اندر تک نہ پہنچنے پائے۔ حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت ہے:۔

ولقد حدثنی ابی ان امہ ام کلثوم امرت بشاۃ فسلخت حین جلد ابو بکرۃ فالبسہا مسکہا۔ فھل کان ذلک الا من ضرب شدید۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۶)

مجھ سے میرے باپ نے روایت بیان کی کہ ان کی والدہ ام کلثوم نے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا۔

اور جب ابو بکرہ کو کوڑے لگائے گئے تو وہ کھال انہیں پہنا دی تو کیا یہ ضربِ شدید سے بچنے کے لئے نہ تھا۔ (دوسری روایت میں ضرب خفیف آیا ہے)

(۰)

۲۔ عینی شاہد کی روئداد

گذشتہ سال مجھے چند ماہ سعودی عرب کے ایک شہر "الخرج" میں گذارنے کا موقع ملا جہاں میں نے ایک بار کوڑوں کی سزا کے نفاذ کا منظر بھی دیکھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سو، دو سو کوڑے بیک وقت نہیں لگائے جاتے، بلکہ چالیس چالیس کوڑے ایک وقت لگاتے ہیں۔ یہ سزا نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد کے باہر میدان میں دی جاتی ہے۔ ایک سو کوڑے سزا ہو تو چار ہفتوں میں پوری کی جاتی ہے۔

اس روز دو مجرموں کو سزا دی گئی، جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک سعودی تھا۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ میدان میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے پاکستانی کو زمین پر منہ کے بل لٹا دیا گیا، دونوں ہاتھ سر سے اوپر آگے کر رکھے تھے۔ ایک قاضی کا نمائندہ اور ایک افسر سرہانے کھڑے ہو گئے اور دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں بید کی چھڑیاں لئے مجرم کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ بید کی چھڑی تقریباً چار فٹ لمبی ہو گی۔ مجرم کے کپڑے نہیں اتروائے گئے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے کھڑے کھڑے باری باری بید مارنے شروع کر دیئے۔ بید مارتے وقت نہ تو انہوں نے گھٹنے جھکائے اور نہ کوئی زور لگایا۔ میرا خیال ہے کہ ۳۰ کوڑے لگانے میں انہیں ۳۰ سیکنڈ لگے ہوں گے، مجرم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح سعودی بھی چالیس کوڑے کھا کر اٹھ گیا، اور دونوں پولیس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان میں سے نہ کسی کا کپڑا پھٹا اور نہ ہی کسی ضرب پر ان کے منہ سے آہ نکلی۔

تو محترمی! یہ ہے سعودی عرب میں کوڑوں کی سزا ——— میرا خیال ہے دوسرے شہروں میں بھی یونہی کوڑے لگائے جاتے ہوں گے۔

طلوعِ اسلام کوڑوں کے متعلق ہماری ..... الجھن اس لئے تھی کہ قرآن کریم نے زانی اور زانیہ کی سزا سو سو کوڑے (جلد) تجویز کی ہے اور جھوٹی تہمت لگانے والے کی اسّی کوڑے۔ ہم سوچتے تھے کہ جب (یہاں کے) پانچ سات کوڑوں سے مجرم کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو اسّی یا سو کوڑوں سے تو اس کا قیمہ ہو جائے گا۔ قرآن کریم کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ کوڑوں کی زیر نظر وضاحت سے بات صاف ہو گئی کہ کوڑوں سے مقصد مجرم کو مضروب کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر احساس ندامت کا بیدار کرنا ہے۔

ویسے، جلدۃ کی جملہ تفاصیل کا تعین، قرآنی مملکت کرے گی۔ کیونکہ خود قرآن نے اس کی تفاصیل متعین نہیں کیں۔

(۰)

حقائق و عبر

۱۔ احکامِ شریعت میں تبدیلی

طلوعِ اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جو احکام اصولی طور پر آئے ہیں اور ان کی جزئیات اللہ تعالیٰ نے متعین نہیں کیں انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان جزئیات کا تعین خود کرے۔ قرآنِ کریم کے اصولی احکام تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن اسلامی مملکت ان جزئیات میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتی رہے گی۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے امتزاج سے اسلامی قوانین و احکام ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہیں گے۔ اس اصول کے مطابق قرآنِ کریم کے اصولی احکام کی جزئیات پہلے پہل عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی مملکت نے متعین کیں اور ان میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ بھی ہوتا رہا۔ لیکن ہمارے پیش کردہ مؤقف کے خلاف قدامت پرست طبقہ کی طرف سے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ حالانکہ ہم نے بار بار اس امر کی وضاحت کی کہ ہمارا یہ مؤقف کچھ نیا نہیں۔ عظیم القدر اسلامی مقننین اور مفکرین ــــــ مثلاً امام ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ کا بھی یہی مؤقف رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مخالفت بدستور قائم رہی، کیونکہ اس کی وجہ مذہب نہیں کچھ اور تھا۔ اب ہمارے سامنے اس باب میں ایک ایسی سند آئی ہے جس کے بعد ان حضرات کے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں کراچی میں رابطۃ العالم الاسلامی (مکہ مکرمہ) کے زیرِ اہتمام پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ محترم رفیع اللہ شہاب صاحب کی روایت کے مطابق اس موقعہ پر رابطہ کے ماہوار عربی ترجمان "رابطۃ العالم الاسلامی" کا رجب ۱۳۹۸ھ (جون ۱۹۷۸ء) کا شمارہ علماء میں تقسیم کیا گیا۔ اس رسالہ میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ لکھا ہے:-

على ان المقصود بالزكوة ان تسد حاجة المحتاجين وتفرج الازمات - فان لم تنفرج الازمة فان وضع القدر المفروض فالحق في المال حق سوى الزكوة وعلى القادرين الاسهام وعلى الدولة ان تاخذ من القادرين - لان رسول الله حدد مقدار الزكوة

بحاجة عصرہ ولم یحدد القرآن مقاریرھا۔ و باب الاجتہاد مفتوح۔ (ص۶۱)

زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ اگر موجودہ شرح سے حاجتمندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ یا زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں، کیونکہ رسول اللہؐ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اور قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کیلئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

جہاں تک ہمارے علم میں ہے رابطہ کے اس فیصلہ کے خلاف ہمارے ہاں کے علماء میں سے کسی نے بھی کوئی آواز بلند نہیں کی۔ گویا ان سب نے اسے صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک بات اگر طلوع اسلام کی طرف سے کہی جائے تو اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا جائے اور وہی بات مکہ مکرمہ کی کسی تنظیم کی طرف سے دہرائی جائے تو وہ عین مطابق اسلام تسلیم کر لی جائے۔ لیکن اس فرق کی کوئی وجہ بھی ہو، ہمارے لئے یہ حقیقت موجب صد اطمینان ہے کہ رابطہ جیسی بین الاقوامی شہرت کی مالک تنظیم نے ایک ایسا اصول تسلیم کر لیا ہے جس سے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ہمارے علماء کرام نے اسے عملاً نافذ ہونے دیا۔

———(٠)———

۲۔ یہ کس قرآن میں ہے؟

سید سلیمان ندوی مرحوم کا علمی دنیا میں جو مرتبہ سمجھا جاتا ہے اس کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ مؤقر جریدہ ایشیا (لاہور) کے ۱۶ رجولائی ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں سید صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "عہد نبوی میں نظام حکومت"۔ اس میں انہوں نے ایک صحابی۔ حاطبؓ ابن بلتعہ کا مشہور واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے کفار قریش کی طرف سے ایک خط لکھا تھا جس میں مدینہ کے بعض مخفی حالات کی خبر درج تھی۔ وہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہے؟ کچھ تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:-

اعملوا ما شئتم وجبت لکم الجنۃ

جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔

اگر سید صاحب زندہ ہوتے تو ہم ان سے پوچھتے (اور اب معاصر ایشیا سے دریافت کرتے ہیں جس میں یہ مضمون شائع ہوا ہے) کہ وہ کونسا قرآن ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ کیونکہ جب یہ کہا جائے کہ——

"خدا نے یہ فرمایا ہے۔ تو اس سے لامحالہ قرآن مجید ہی مراد ہوگا۔ قرآن کریم میں "اعملوا ما شئتم" کے الفاظ ایک ہی جگہ آئے ہیں جہاں کفار سے کہا گیا ہے: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (۴۱/۴۰) "تم جو جی میں آئے کرو خدا تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے"۔

بہرحال یہ ہے ان حضرات کا علم قرآن مجید سے متعلق! اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود نہ لیا ہوتا تو نہ معلوم سابقہ آسمانی کتابوں کی طرح اس کا بھی کیا حشر ہو جاتا؟

(۰)

۳۔ جرائم کی پردہ پوشی

مندرجہ بالا مضمون میں سید صاحب مرحوم نے یہ بھی کہا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جرائم کی پردہ پوشی کی جائے۔ اس کی تائید میں انہوں نے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ ان میں ایک روایت یہ بھی ہے:-

> دخلین حضرت عقبہؓ ابن عمرو صحابی کے منشی تھے۔ انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسایہ شراب پیتے ہیں۔ میں نے ان کو منع کیا۔ وہ لوگ باز نہیں آتے۔ اب ان کے لئے پولیس بلاتا ہوں۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا۔ درگذر کرو۔ دخلین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ ترک شراب کا انکار کرتے ہیں۔ پولیس کو بلاتا ہوں۔ حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو، کیونکہ میں نے آنحضرتؐ سے سنا ہے کہ:-
>
> من رای عورۃ فسترھا کان کمن یحیی موءدۃ
>
> جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

(۰)

۴۔ اندر کی باتیں باہر آ رہی ہیں!

پاکستان قومی اتحاد کی پارٹیوں میں پھوٹ پڑی ہے تو اندرون خانہ کی بڑی دلچسپ باتیں باہر آ رہی ہیں۔ پچھلے ماہ (جولائی) میں جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ملتان میں فرمایا:-

> قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ مملکت مستحکم ہو۔ مفتی صاحب نے تحریک نظام مصطفےٰؐ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

(۰)

یومِ آزادی کی تقریب

یومِ آزادی کی تقریب، زندہ قوموں کی زندگی میں حاصلِ زندگی ہوتی ہے۔ لیکن جس افسردگی اور بے دلی سے ہمارے ہاں یہ رسم ادا کی جاتی ہے وہ اس حقیقت کی غماز ہوتی ہے کہ قوم صرف سانس لے رہی ہے، اس کی رگوں میں خونِ زندگی باقی نہیں رہا۔ لیکن طلوعِ اسلام کی تواپنی روایت ہے۔ اسی روایت کے مطابق امسال یومِ آزادی کے سلسلہ میں، ۱۸ر اگست[1]، جمعہ کو پرویز صاحب نے خصوصی درس سے نوازا۔ جس کا عنوان تھا ——— "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" ——— اگرچہ اس دن گرمی کی شدت تھی لیکن سامعین کی کثرت جگہ کی تنگی کی شکوہ سنج تھی۔ انہوں نے اس درس کو، جو دو گھنٹے سے زائد عرصہ پر مشتمل تھا جس ذوق و شوق اور سکون و اطمینان سے سنا اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ اگر قوم کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں اور پیش کئے جائیں، دلآویز انداز میں، تو وہ ان کے قلوب کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ درس، طلوعِ اسلام کی حالیہ اشاعت میں شامل نہیں کیا جا سکا، اگرچہ اس کا پمفلٹ چھپ گیا ہے۔ اسے اکتوبر کے شمارہ میں درج کیا جائے گا۔ ایسا اس لئے بھی ہوا کہ، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، ستمبر کا شمارہ، شہدائے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد کی نذر کیا جا رہا ہے جن کے احسان سے ملت کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

—— (٥) ——

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف "قرآنی قوانین" ——— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادی اہمیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) بیس روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

---

[1] یومِ آزادی، ۱۴ر اگست ہے۔ (اگست کے شمارہ کے لمعات میں غلطی سے (۱۵) اگست چھپ گیا) چونکہ پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس جمعہ کے دن ہوتا ہے اس لئے ہم نے اس تقریب کو اس دن (۱۸ر اگست کو) منایا۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزم طلوع اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT ROAD,
LONDON E13 — 9NR.
PHONE 01 — 552 -1517.

لاہور میں ہر جمعہ ۸½ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (فون 30890)
(عقب اڈہ لاریاں۔ مائی دی جھگی)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
کتب خانہ بزم طلوع اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی نمبر ۲

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان، آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل دی پی آئی مین گیٹ پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ۔

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار چار بجے شام بمقام ۱۲/۱/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ بوقت ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
(گجرات) دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر مرحوم کے مکان نمبر ۳۵۱ (وارڈ نمبر ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ بزم طلوع اسلام کے اوقات کار حسب ذیل ہیں:-
ہر روز علاوہ جمعہ:- صبح ۱۰ بجے تا ایک بجے دوپہر
شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

محمد اسلام

کتب خانہ بزم طلوع اسلام
کمرہ نمبر ۲۴ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی نمبر ۲

کتب خانہ میں
ادارہ طلوع اسلام کی جملہ مطبوعات
دستیاب ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ تحریر کرکے
منگوائی بھی جاسکتی ہیں۔

اے دوست سُنائے جا بھولے ہوئے افسانے

شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں!

زندہ قومیں، ان واقعات کی یاد تازہ کرنے کی تقاریب، جنہوں نے انہیں حیاتِ تازہ عطا کی ہو، بڑے خلوص و احترام، تزک و احتشام، اور جوش و خروش سے مناتی ہیں۔ تاریخ پاکستان میں دو واقعات ایسے گذرے ہیں جنہوں نے ہمیں فی الواقعہ حیاتِ تازہ عطا کی تھی۔ ایک یومِ آزادی اور دوسرا، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ——— چونکہ ہم خود ہی زندگی کی حرارت سے محروم ہو رہے ہیں، اس لئے ان حیات بخش واقعات کی، اُن کے شایانِ شان، یاد منانا تو ایک طرف، رفتہ رفتہ انہیں حافظہ سے محو کئے جا رہے ہیں ——— مُردے اپنی سالگرہ نہیں منایا کرتے۔

لیکن

طلوعِ اسلام کے نزدیک تو ان عظیم واقعات کا شمار "ایام اللہ" میں ہوتا ہے، اس لئے ان کی یاد تازہ رکھنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ ہر سال، جنگِ ستمبر کی یاد میں خصوصی مقالات شائع کرتا رہتا ہے جو بالعموم مبنی ہوتے ہیں پرویز صاحب کے خطابات پر۔

امسال وہ چند ایسی یادداشتیں ہدیۂ قارئین کر رہا ہے، جن کا شمار نوادرات میں ہونا چاہیئے۔ امید ہے ان سے ہمارے عروقِ مردہ میں کچھ تو حرارت پیدا ہو گی۔

شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۶۵ء

شہر کے لوگ

پرویز صاحب کی تقریر جو انہوں نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی شب ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی

برادرانِ عزیز! سلامت و رحمت!

جب سے سورج نے اپنی آنکھ کھولی ہے زمین کا یہ سلسلۂ روز و شب جاری ہے۔ عام حالات میں رات اور دن کی اس گردشِ لامتناہی کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

لیکن صبح و شام کے اس بے حرکت و بے رنگ سلسلہ میں، بعض دن ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا نے ایام اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کے اپنے دن۔ یہ "خدا کے اپنے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی فیصلہ کن معرکہ رونما ہوا ہو۔ گذشتہ ستمبر کے سترہ دن ہمارے ہاں بھی ایسے آئے جنہیں بجا طور پر ایام اللہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان میں حق و باطل کا وہ قیامت خیز معرکہ سرزد ہوا جس نے پاکستان کی تاریخ ہی کے نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ کے صفحات پر اپنا نقشِ دوام اس طرح ثبت کر دیا ہے کہ گردشِ لیل و نہار کا کوئی حادثہ اسے محو نہیں کر سکتا۔ اس معرکہ میں ہم نے کیا کچھ حاصل کیا۔ اس کی تفاصیل کا بیشتر حصہ اس وقت تک آپ کے سامنے آچکا ہے اور باقی ماندہ آہستہ آہستہ سامنے آتا رہے گا۔ دشمن کا سینکڑوں میل پر مشتمل رقبہ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ہم نے اس کے لاتعداد ٹینک تباہ کر دیئے اور متعدد صحیح و سالم ہماری گرفت میں ہیں۔ ہم نے اس کے سینکڑوں طیاروں کے پرخچے اڑا دیئے اور بیسیوں ہمارے ہاں پابندِ قفس ہیں۔ اس کے بے شمار قیدی محبوس ہوئے اور بے حد و نہایت اسلحہ اور دیگر سامان ہمیں بطورِ غنیمت ملا۔ یہ سب فتوحات بڑی قیمتی ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ بیش قیمت متاع ایک اور ہے جو ہمیں اس جنگ سے حاصل ہوئی، وہ متاعِ بے بہا یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو پا لیا۔ صدیوں سے ہماری قوم اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسے اپنے آپ کا علم ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر کس قدر ممکناتِ زندگی مضمر ہیں۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیسی محیر العقول خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اسے اس کا مطلقاً اندازہ نہیں تھا۔ ہم پانچ ستمبر کی شام کو سوئے تو اسی قوم کے افراد تھے۔ لیکن جب ۶ ستمبر کی صبح کو بیدار ہوئے تو وہ کوئی اور ہی قوم تھی۔ ریاض خیر آبادی نے کہا تھا کہ:

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

۶ ستمبر کی صبح دشمن کی توپوں کی گرج نے جو فضا کے پردے چاک کئے ہیں تو ہمارے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں میں ہمیں اپنے آپ کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی تھی، لیکن اس کے بعد ہم اپنی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی خرابی ایسی نہیں تھی جو ہمیں اپنے اندر دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بعض خرابیاں فی الواقعہ موجود تھیں۔ لیکن ایک مسلسل پروپیگنڈے نے ہمارے اندر ایسا احساسِ کمتری پیدا کر دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دنیا کی ناکارہ ترین قوم ہیں، ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ہمیں پاکستانی کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

اس احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لئے قرآن کریم کی راہ نمائی ہمارے سامنے تھی۔ وہ ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا کہ: وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.... (۳/۱۳۹) تم گھبراتے کیوں ہو۔ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھ کر خود اعتمادی پیدا کر لو، تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ ہم سے بار بار کہتا تھا کہ تم اپنی تعداد کی کمی سے مت گھبراؤ۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ (۸/۶۵) اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آ جائیں گے۔ ہم ان آیات کو پڑھتے اور ان کی تلاوت کا ثواب حاصل کر کے قرآن کو پھر بالائے طاق رکھ دیتے۔ تاریخ میں ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے وہ محیر العقول کارنامے آتے جنہیں ہمارے لئے نمونہ بننا تھا۔ ہم ان کارناموں کو پڑھتے تو اپنی بے عملی اور دوں ہمتی کو اس خود فریبی کے پردے میں چھپا کر آگے بڑھ جاتے.... کہ یہ سب کچھ معجزات اور کرامات کی رو سے ہوا تھا۔ اب وہ معجزے کس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟

ہمارا حکیم الامت ہم سے بار بار کہتا کہ: ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

لیکن ہم اسے ایک شاعر کا سہانا خواب کہہ کر حوالۂ طاؤس و رباب کر دیتے۔ یہ کچھ ہوتا رہا، اور ہم بدستور سوئے رہے۔ لیکن ۶ ستمبر کی صبح توپوں کے ایک ہی دھماکے نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور قوم کے تحت الشعور میں خوابیدہ قوتیں اس طرح ابھر کر سامنے آ گئیں جس طرح برقِ خاطف کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، مضراب کی ایک ضرب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ثریا شکار طیاروں کے جانفروش شاہینوں کو دیکھا تو وہ اس حقیقت کی عملی تفسیر تھے کہ: ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ہم نے اپنی بری اور بحری فوجوں کے جانبازوں پر نگاہ ڈالی تو اُن کا جوشِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ:؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی!
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

ہم نے اپنی قوم کی طرف دیکھا تو وہ، ہمت، استقامت، عزم، ایثار، بلند حوصلگی، کشادہ نگہی، خود فراموشی اور اقدار پرستی کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ قوم کیا تھی۔ ایک ٹیم تھی، جس کے ہر کھلاڑی کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی اپنی ٹیم کی کامیابی اور فریقِ مقابل کی شکست۔ آسمان کی آنکھ اس قوم کو دیکھ کر ششدر و حیران تھی اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قوم ہے جسے اُس نے گذشتہ شب کی تاریکی میں لپیٹ کر سلایا تھا!

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ متاعِ بے بہا جو ہمیں اس معرکۂ حق و باطل سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا: وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الذّٰریٰت ۲۱) تم معجزات اور کرامات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ تم خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ اس میں تمہیں ایسی ایسی محیر العقول قوتیں نظر آئیں گی جن کا تم قیاس و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو فی الواقعہ وہاں ان قوتوں کا بے بہا ذخیرہ تھا۔ ان سے ہمیں اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ ہمارے اسلاف سے جو معجزانہ کارنامے سرزد ہوئے تھے وہ ان کے ذوقِ یقین اور جوشِ کردار کے مظاہرے تھے۔ وہی معجزے ہم سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم حاصل ہو، اور اس مقصد کے حصول کے لئے جذبۂ عمل بیدار۔ اس سے وہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:؎

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

سوال یہ ہے کہ ان بے پناہ قوتوں کو جو ہم میں ہنگامی طور پر بیدار ہوئی ہیں، مستقل متاعِ حیات کیسے بنایا جائے؛ ہمارے مستقبل کا دار و مدار اسی سوال کے اطمینان بخش جواب پر ہے اور یہ جواب قرآن کے سوا اور کہاں سے مل سکتا ہے؛ والسلام!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان)

● پرچہ کی ترسیل کے لئے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔

شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۶۵ء

اِن کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے

(۱)

کہتے ہیں کہ روما کے ایک گرجے میں حضرت عیسےٰؑ کی ایک نادر تصویر تھی جس سے دیکھنے والوں کے دل میں عجیب و غریب تاثرات پیدا ہوتے تھے۔ حضرت عیسےٰؑ کے پرستار آتے اور اپنی عقیدت کی شمعیں تصویر کے نیچے روشن کرتے۔ ان شمعوں کا دھواں اس تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا، رفتہ رفتہ، اس دھوئیں کی سیاہی، نے پوری کی پوری تصویر کو ڈھانپ لیا۔ اب عقیدت کی شمعیں تو بدستور جلتی ہیں لیکن تصویر کا صرف چوکھٹا دکھائی دیتا ہے۔ اصل تصویر پر دھوئیں کی سیاہ چادر پھیل چکی ہے۔ اور یہ چادر دن بدن دبیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔

حضرت عیسےٰؑ کی اس تصویر کی داستان حقیقی ہو یا تمثیلی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے عظیم انسانوں کے درخشندہ کارنامے، جنہوں نے آنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال بننا ہوتا ہے، ان کے عقیدتمندوں کی افسانہ طرازیوں کے نیچے اس طرح دب جاتے ہیں کہ اس کے بعد افسانے باقی رہ جاتے ہیں اور حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ہماری تاریخ میں، نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کا دور، صداقت، شجاعت، عدالت، حسنِ کردار۔ اور حسنِ عمل کے محیر العقول کارناموں کی درخشندہ مثالوں کا دور تھا۔ یہ وہ کارنامے تھے جنہیں آنے والوں کے لئے، زندگی کے مہیب خطرات اور جانگسل مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے، بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) بننا تھا۔ ان کارناموں کی ایک ایک مثال ایسی تھی جیسے حوادثِ زمانہ کی تلاطم خیزیوں میں روشنی کے مینار کا کام دینا ہوتا۔ جسے نازک سے نازک وقت میں، گرتے ہوئے حوصلوں کو سنبھالنا اور ڈوبتی ہوئی ہمتوں کو ابھارنا تھا۔ ان کارناموں نے خطرات میں گھرے ہوئے انسان کو یہ بتانا تھا کہ جب، ایک انسان، اس سے زیادہ پُرخطر اور نازک حالات میں ایسے حیرت انگیز کام کر سکتا ہے، تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا؛ جب انہوں نے ایسے وقت میں یہ کچھ کر دکھایا تھا، تو مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ جب وہ یہ کچھ کر سکتے تھے، تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ اس طرح ماضی کی ان داستانوں نے آنے والوں کے لئے حال کی تابندگی اور مستقبل کی درخشندگی کا موجب بننا تھا۔

لیکن اس درخشندہ و تابناک دور کی تاریخ کے ساتھ بھی ہماری عقیدت مندیوں نے وہی کچھ کیا جو حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کے ساتھ ہوا تھا۔ اس عہد کے ان کارناموں کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کے کارنامے نظر ہی نہیں آتے بلکہ مافوق البشر (بلکہ مافوق الفطرت) قوتوں کے مظاہر سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کارناموں کے متعلق قدم قدم پر یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ حق پرست انسانوں کے دست و بازو کے معرکے نہیں تھے، براہِ راست خدا کی تائید غیبی کے مظاہر تھے۔ میدانِ کارزار میں ان کی حیرت انگیز کامرانیاں اور فتحمندیاں، ان کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور جوششِ کردار کا نتیجہ نہیں تھیں، وہ آسمان سے نازل ہونے والے فرشتوں کے کارنامے تھے۔ جو مثالی کارنامے خود نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سے سرزد ہوئے تھے، وہ معجزات تھے جو نبی کے سوا اور کسی سے سرزد نہیں ہو سکتے۔

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہی کارنامے، جنہیں اسلام کی تاریخ ہی میں نہیں، نوعِ انسانی کی تاریخ میں، انسانی ممکنات کی درخشندہ تصویر بننا تھا، ہماری عقیدت مندی میں اضافہ کا موجب تو بنتے ہیں، قابلِ تقلید مثال نہیں بن سکتے۔ چنانچہ جب ان کارناموں کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے ہمارا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ خدا نے حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرنا تھا۔ اسلام کا بول بالا کرنا اور کفار کو نیچا دکھانا، اس کا طے شدہ پروگرام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ خدا کا طے شدہ پروگرام تھا تو ایسا ہو کر رہنا تھا۔ کفارِ عرب تو ایک طرف ساری دنیا بھی مقابلہ کے لئے آجاتی تو خدائی پروگرام کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھوں (بظاہر) یہ کارنامے سرزد ہوئے وہ محض خدائی فیصلہ کے سامنے لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ اس میں ان کی کسی حسنِ کارکردگی کا دخل نہیں تھا۔

اور جب رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے معرکہ آرا کارنامے سامنے آتے ہیں، تو ہمارے دل میں فوراً یہ خیال ابھر آتا ہے کہ ہاں صاحب! وہ خدا کے رسول تھے۔ اب ان جیسے کام کون کر سکتا ہے؛ کس بشر کی مجال ہے کہ ان کارناموں کی گرد تک پہنچنے کا خیال تک بھی دل میں لائے۔ ایسا تصور کرنا کہ کوئی انسان اس قسم کے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے، شانِ رسالت میں انتہائی گستاخی اور سوءِ ادبی ہے۔

اور جب صحابہ کبارؓ کی محیر العقول معرکہ آرائیاں۔ ان کی عدیم النظیر قربانیاں، ہجومِ مصائب میں ان کی کوہ آسا استقامت۔ انبوہِ مشکلات میں ان کی جنت بداماں جمعیتِ خاطر، میدانِ کارزار میں ان کی بے پناہ ہمت اور شجاعت۔ نازک سے نازک وقت میں ان کی صداقت۔ غالب آجانے کی صورت میں ان کی عدالت۔ غرضیکہ مستقل اقدارِ انسانیت پر ان کا یقینِ محکم اور ان کے تحفظ کے لئے ان کا عملِ پیہم۔ جب ان کے تذکرے ہمارے سامنے آتے ہیں، تو ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ ان کے کیا کہنے ہیں۔ وہ رسول اللہؐ کے صحابیؓ تھے۔ ہم گنہگار ان کی ریس کیسے کر سکتے ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ ایسی نادر اور درخشندہ تصویر، کس طرح ہماری عقیدتمندیوں کی شمعوں کے دھوئیں سے چیکٹ ہو کر رہ گئی؟ ایسی چیکٹ کہ اگر اب کوئی، اسے کھرچ کر اصل تصویر سامنے لانے کی کوشش کرے تو پجاری اسے ملحد و بے دین قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیں۔ اس لئے کہ پجاریوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل تصویر لوگوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ اگر وہ تصویر بے نقاب ہو کر سامنے آجائے تو لوگ، ان پجاریوں کی شباہت کو تصویر کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے اور جب ان دونوں میں کوئی مماثلت نظر نہیں آئے گی تو ان پجاریوں کا پیستار کوئی نہیں رہے گا۔

حق و صداقت کا مقصد لے کر اٹھنے والوں کے ساتھ خدا کی تائید و نصرت برحق ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ تائید و نصرتِ خداوندی ہے کیا اور یہ حاصل کیسے ہوتی ہے؟

اللہ تعالےٰ نے خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے لئے کچھ قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بار آور ہو جاتی ہیں، جس کی محنت، ان قوانین سے ہم آہنگ ہوتی ہے اس کے نتائج عام اندازوں سے کہیں زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ (مثلاً) اگر ایک شخص اپنی کشتی پانی کے بہاؤ کی طرف چلاتا ہے تو کشتی کی رفتار بہت تیز ہو گی۔ اگر وہ اپنی ناؤ ندی کے چڑھاؤ کی طرف لے جاتا ہے تو اسے مشقت بھی سخت اٹھانی پڑے گی اور کشتی کی رفتار بھی بہت کم رہے گی۔

خارجی کائنات کے قوانین کی طرح، انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق بھی خدا کے قوانین متعین ہیں (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ اگر کوئی فرد یا قوم ان قوانین کے مطابق کام کریگی تو اس کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔ جو قوم ان کے خلاف چلے گی، وہ کامیاب نہیں ہو گی۔ (مثلاً) اس کا قانون یہ ہے کہ: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱) ظلم و زیادتی کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی جماعت مظلوم کی حمایت میں، ظالم کے مقابلہ کے لئے اٹھتی ہے، تو (مادی اسباب و ذرائع کے برابر ہونے کی صورت میں بھی) ان کی کوششوں کے نتیجہ میں وہی فرق ہو گا جو کشتی کو بہاؤ کی طرف چلانے والے اور چڑھاؤ کی طرف کھینے والے کے نتیجہ میں فرق ہوتا ہے۔ جو مقصد حق و صداقت پر مبنی ہو، اس کی محکمیت پر یقین (جسے ایمان کہتے ہیں) انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے، اور زاویۂ نگاہ کے بدل دینے سے انسان کے اندر جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس سے وہ (گویا) ایک دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت اس اصول (یا مستقل قدر) اور طبعی زندگی کے کسی مفاد میں ٹکراؤ ہو جائے (ان میں T I E پڑ جائے) تو یہ شخص (یا قوم) مستقل قدر کی حفاظت کے لئے، اس طبعی مفاد کو بلا تامل قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر اس کے لئے اسے جان تک بھی دینی پڑے، تو اس میں بھی اسے ذرا تردد نہیں ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص کسی مقصد کی حفاظت کے لئے بطیبِ خاطر، دیکھ بھال اور سمجھ سوچ کر، جان تک دینے کے لئے تیار ہو، اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں خوابیدہ

ہوتی ہیں جن کا اسے عام حالات میں خود بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ جب وہ کسی متاعِ عزیز کے تحفظ کی خاطر، خطرات کا سامنا کرتا ہے اور یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے، تو اس کی خوابیدہ قوتیں یک لخت بیدار ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے محیر العقول کارنامے سرزد ہو جاتے ہیں، جن پر اور تو اور، وہ خود حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا؛ اسے کہتے ہیں تائیدِ غیبی۔ اسے کہتے ہیں خدا کی نصرت۔ اسے کہتے ہیں فرشتوں کی مدد۔

اس سے واضح ہے کہ یہ تائیدِ غیبی، یہ خدا کی نصرت، حاصل اسے ہوتی ہے جو خود اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ تائید و نصرت، اس تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی کا نام ہے خدا کی معیت (خدا کا کسی کے ساتھ ہونا)۔ جو شخص اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے خدا اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا یونہی بیٹھے بٹھائے کسی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور جس کے ساتھ خدا ہو جاتا ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ (مثلاً) قرآن کریم میں ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (۸/۴۶) "خدا صابرین کے ساتھ ہوتا ہے" یعنی جو لوگ حق و صداقت پر مبنی مقصد کی خاطر، خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور اس میں پوری پوری استقامت سے کام لیتے ہیں۔ کسی مقام پر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی۔ خدا ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس مقام پر یہ اصول بیان ہوا ہے، وہ آیات یوں ہیں:-

اے جماعتِ مومنین! جب تمہیں دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنا پڑے تو جم کر کھڑے ہو جاؤ اور قوانینِ خداوندی کو بڑی شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اور خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ آپس میں مت جھگڑو۔ ایسا کرو گے تو تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم ثابت قدمی سے کام لو۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ (۸/۴۵-۴۶)

یہی وہ ثابت قدم ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ "اگر یہ دو سو ہوں گے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے"۔ اور اگر سامانِ حرب و ضرب کی کمی ہو گی تو بھی "یہ اپنے سے دگنوں پر تو ضرور غالب آ جائیں گے۔ (۸/۶۵-۶۶)۔ اب رہی "فرشتوں کی مدد" تو اسے بھی استقامت سے مشروط قرار دیا۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے۔

جو لوگ اس حقیقت پر یقینِ محکم رکھتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو (تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ) ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ جو ان سے کہتے ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔ بالکل نہ گھبراؤ..... ہم دنیا اور آخرت دونوں میں، تمہارے رفیق ہیں۔ (۴۱/۳۰)

اس "نزولِ ملائکہ" سے کیا ہوتا ہے؟ دلوں کو سکون و طمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کو جمعیتِ خاطر نصیب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بدر کے میدان میں جن فرشتوں کے نزول کا ذکر آیا ہے ان کے متعلق کہا ہے کہ ..... لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ۔ (۸/۱۰) "تاکہ اس سے تمہارے دلوں کو طمانیت نصیب ہو جائے"۔ اس کے ساتھ پھر یہ واضح کر دیا کہ: بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ (۳/۱۲۵) دشمن خواہ کتنے ہی جوش و خروش سے تم پر حملہ کرے۔ اگر تم ثابت قدم رہے اور اپنے فرضِ منصبی (ڈیوٹی) کو نہ بھولے۔ تو پھر "ملائکہ کا نزول" ہوگا ——— اسی کو خدا کی نصرت سے تعبیر کیا گیا ہے — وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ (۳/۱۲۳)۔

ان مقامات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ خدا کی تائید و نصرت سے مفہوم کیا ہے اور یہ کن لوگوں کو، کن شرائط کے پورا کرنے کے بعد ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک ایسا اصول بیان کر دیا ہے جس کے بعد اس باب میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سورۂ محمدؐ میں جنگ کے سلسلہ میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔ (۴۷/۷)

اے ایمان والو! اگر تم نے خدا کی مدد کی تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ یعنی تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔

"اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا"۔ یہ "خدا کی مدد کرنا" اس کے سوا کیا ہے کہ تم حق و صداقت کا مقصد (CAUSE) لے کر اٹھو اور خدا کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق اقدامات کرو۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خطرات کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو گے۔ اور اس ثابت قدمی کا نتیجہ فتح و کامرانی ہوگا۔

یہ ہے خدا کی تائید و نصرت کا مفہوم۔ یعنی اس میں پہل یا سبقت (INITIATIVE) انسان کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جب انسان اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کر لیتا ہے تو اس کے بعد، تائید و نصرتِ خداوندی کا حاصل ہونا، لازمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں خدا خود یہ کہتا ہے کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷) اس قسم کا یقین محکم رکھنے والوں کی نصرت، ہم پر فرض ہو جاتی ہے۔ جو قوم اس قسم کی تبدیلی اپنے اندر پیدا نہیں کرتی، اس کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اسے خدا کی تائید نصیب نہیں ہوتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)۔ اس کا واضح فیصلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس قسم کے صاحبانِ عزیمت و استقامت، خطرات کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں تو اس کا سارا (CREDIT) انہی کو ملتا ہے۔ ان پر خدا کی طرف سے تحسین و تبریک کے پھول نچھاور ہوتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲/۱۵۷) خدا ان پر سلام و صلوٰۃ کے ڈونگرے برساتا ہے۔ خدا نے یہ نہیں کہا کہ اس میں ان لوگوں کی کیا کاریگری تھی؟ یہ تو سب کچھ ہماری تائید سے ہوا؟ نہ ہی یہ کہا کہ یہ کارنامے

ہمارے فرشتوں کے ہیں۔ فرشتے تو خود، خدا کے ساتھ ان اربابِ عزم و ہمت کی حمد و ستائش میں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ سورۃ احزاب میں ہے۔ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ (۳۳/۴۳) خدا اور اس کے فرشتے تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں — یاد رکھئے! انسانوں کی دنیا میں خدا کے کام انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ اگر ایک قوم، ان امور کی سرانجام دہی کے لئے نہیں اٹھتی تو وہ یہ نہیں کہتا کہ تم نہیں اُٹھتے ہو تو نہ اٹھو، ہم یہ کام تمہاری مدد کے بغیر خود کر لیں گے، یا اپنے فرشتوں کے ذریعے کرا لیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کے لئے تیار نہیں ہوتے تو ہم تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئیں گے — وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ وہ ان امور کی سرانجام دہی کے لئے پوری جدوجہد کرے گی۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵/۵۴) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرے گی۔

رسول اللہ صلعم کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ — (۱۸/۱۱۰) "ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس فرق کے ساتھ کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔" وحی موہبتِ خداوندی ہے جس میں نبی کے اپنے اختیار و ارادہ، یا خیالات و خواہشات کا دخل نہیں ہوتا۔ اسے یہ علم خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے، جسے وہ عام انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ خصوصیت نبی کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔

رسول کا فریضہ وحیٔ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس پر خود عمل کرتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں وحی کی یہ تعلیم ایک عملی نظام بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے لئے اسے سخت ترین مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیسیوں لڑائیاں لڑنی پڑتی ہیں۔ پھر جب یہ نظام متشکل ہو جاتا ہے، تو اُسے وہ تمام امور سرانجام دینے ہوتے ہیں جو ایک مملکت کے سربراہ کے فرائض کہلاتے ہیں۔ وہ یہ تمام امور، ایک انسان کی حیثیت سے سرانجام دیتا ہے اور اس میں اپنے حسنِ تدبّر اور سیرت و کردار کا ایسا مثالی نمونہ پیش کرتا ہے جسے شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کہا جائے — جیسا کہ کہا جا چکا ہے، رسول یہ سب کچھ ایک انسان کی حیثیت سے کرتا ہے اور اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر (SUPERNATURAL ELEMENT) شامل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی دوسرے انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار پاتی ہے۔ اگر رسول یہ کچھ ایسی مافوق الفطرت قوتوں کی رو سے کرے جو دوسرے انسانوں کو میسر نہیں آسکتیں تو دوسرے انسانوں کے لئے اس کی زندگی نمونہ کس طرح بن سکتی ہے؛ رسول کو جو تائیدِ خداوندی حاصل ہوتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی وہ قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کرتا ہے اور اس کے خوشگوار نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ اگر (بالفرضِ محال) وہ کسی قانونِ خداوندی کی

خلاف ورزی کرے تو اُسے بھی اس سے ویسا ہی نقصان پہنچے جیسا دوسرے انسانوں کو۔ چنانچہ اس ضمن میں خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ: قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۳۹/۱۵) "ان سے کہدو کہ اگر میں خدا کی نافرمانی کروں، تو میں ڈرتا ہوں کہ خدا کا تباہ کن عذاب مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔"

لہٰذا، جو کچھ نبی اکرمؐ نے "بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" کی حیثیت سے کر کے دکھایا تھا، وہ دوسرے انسانوں کے لئے ماڈل تھا۔ یہ ہے وہ ماڈل جو زندگی کی مکمل ترین نمائندگی کرتا، اور مقامِ انسانیت کی حسین ترین تفسیر سامنے لاتا ہے۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والوں سے پکار کر کہتا ہے کہ تم ہمت کیوں ہارتے ہو، افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اٹھو۔ قدم بڑھاؤ اور دیکھو کہ تم بھی کس طرح یہی کچھ کر سکتے ہو!

لیکن معاشرہ کا قیام اور مملکت کی تشکیل، ایک فرد کا کام نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحابہ کبارؓ اسی جماعت کے افراد تھے۔ انہی کے متعلق کہا گیا تھا کہ: هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۸/۶۲) "اے رسول! خدا نے تمہیں اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین سے تقویت عطا کی۔" یہ جماعت بھی انسانوں ہی پر مشتمل تھی اور ان کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے تھے۔ انہیں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں انہی قوانین کے اتباع سے ہوئیں۔ اور جہاں ذرا سی لغزش ہوئی، انہیں بھی اسی طرح شکست ہو گئی جس طرح دوسرے انسانوں کو ہوتی ہے۔ چنانچہ ان شکستوں کا ذکر خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا قُلْتُمْ اَنّٰی هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ ..... (۳/۱۶۴)

جب تمہیں شکست کا نقصان اٹھانا پڑا ـــــ حالانکہ اس سے پہلے تم دشمن کو اس سے دگنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ شکست کیوں ہوئی؟ ان سے کہہ دو کہ یہ تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے ہوئی۔

دوسری جگہ ہے:۔

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ۔ (۳/۱۳۹)

اگر جنگ میں تمہیں شکست کا زخم لگا ہے تو (اس سے پست ہمت ہونے کی کوئی بات نہیں)۔ اس سے پہلے تمہارے دشمن کو بھی اسی قسم کا زخم لگ چکا ہے۔ یہ میدانِ جنگ ہے۔ اس میں اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔

لہٰذا، جو کچھ صحابہ کبارؓ نے کر کے دکھایا، وہ ان کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی فوق الفطرت

عنصر کارفرما نہیں تھا۔ انہوں نے انسانوں کی حیثیت سے سب کچھ کیا۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ ہر انسان کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسی طرح قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے۔ جنگِ اُحد میں، نبی اکرمؐ سپہ سالار تھے اور صحابہؓ کی جماعت، فوج۔ اس کے باوجود، جب لشکر کے ایک دستہ سے ذرا سی غلطی ہوئی تو میدان کا رُخ بدل گیا اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا حتیٰ کہ خود نبی اکرمؐ بھی زخمی ہوگئے۔ اس کے بعد، جب اس غلطی کو درست کر لیا تو اس نقصان کی تلافی ہوگئی۔ اسی طرح جنگِ حنین میں جب مسلمانوں کا لشکر اپنی کثیر تعداد پہ اترا گیا اور ان بنیادی خصوصیات سے ذرا غافل ہوگیا جن کی وجہ سے کامیابی ہوتی ہے تو اسے شکست ہوگئی۔ لیکن جب وہ پھر انہی خصوصیات کی طرف آگئے تو یہی شکست فتح میں تبدیل ہوگئی۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں کوئی مافوق الفطرت قوت کام نہیں کرتی۔ مافوق الفطرت قوت کا تصور یوں پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ باہمّت انسان کر گزرتے ہیں، بے ہمّت انسان اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا اس لئے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلّی دے لیتا ہے کہ اس (باہمّت) انسان کو کوئی فوق الفطرت قوت حاصل تھی جس کی وجہ سے اس نے ایسا محیرالعقول کارنامہ کر دکھایا۔ اس جھوٹی تسلّی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کوشش ہی نہیں کرتا کہ خود بھی باہمّت بن کر اُسی جیسے کارنامے کر دکھائے۔ اور جب کوئی قوم بے ہمّت ہو جائے تو وہ اپنے ماضی کے تابندہ کارناموں کے متعلق بھی یہی ذہنیت پیدا کر لیتی ہے کہ ان لوگوں کو خدا کی طرف سے فوق الفطرت قوتیں حاصل تھیں جن کی وجہ سے وہ ایسا کر گزرے۔ ہمیں نہ وہ قوتیں حاصل ہیں۔ نہ ہی ہم وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کی وہی داستانیں جنہیں قوم کیلئے مضرابِ عمل بننا تھا، نیند آور لوریاں بن جاتی ہیں۔

ہم انہی خواب آور لوریوں میں مست تھے کہ ہند و پاکستان کی حالیہ (ستمبر ۱۹۶۵ء کی) جنگ میں ہمارے جیوش و عساکر نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہمارے اسلاف نے جو محیرالعقول کارنامے سرانجام دیئے تھے وہ ان کے مقصد کی صداقت۔ ان کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں تھا۔ اس لئے جو لوگ بھی اسی انداز کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند سے کام لیں گے، ان سے اسی قسم کے حیرت انگیز کارنامے سرزد ہو جائیں گے۔ چونکہ ان سپاہیوں کے ساتھ ہماری "روحانی عقیدتمندیاں" وابستہ نہیں ——— ہم اٹھارہ برس سے دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ وہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں ... اس لئے ان کی حق پرستی، فرض شناسی، جاں سپاری، خودسپردگی، ہمّت، شجاعت، بسالت، استقامت، کے کارنامے ہمارے لئے مثال بن سکتے ہیں ——— اور یہ اس جنگ کا بڑا ہی خوشگوار پہلو ہے۔ اس نے ہماری غلط نگہی کو دور کر کے حقائق بینی سکھا دی ہے۔ اس نے ہماری تاریخ میں ایک نئے درخشندہ باب کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ہم بڑے افسوس سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کے کارناموں کو بھی فوق الفطرت توہم پرستیوں کی

چادروں میں لپیٹا جا رہا ہے۔ کہیں یہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ ایک ہندو پائلٹ نے (جو ہمارا قیدی ہے) — بتایا کہ جب ہم، پاکستان کی فوجوں پر، اوپر سے گولے پھینکتے تھے تو ہم دیکھتے تھے کہ نیچے ایک سفید ریش، سبز پیرہن، بزرگ کھڑے ہیں اور وہ ہمارے گولوں کو، کرکٹ کی گیند کی طرح، ہاتھوں میں دبوچ کر دوسری طرف پھینک دیتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ جب سکھ سپاہی قید ہو کر آئے تو انہوں نے پاکستانی فوج کو بڑی حیرت سے دیکھا اور کہا کہ وہ فوج کہاں ہے جو ہمارے سامنے میدانِ جنگ میں لڑتی تھی؟ جب ان سے کہا گیا کہ وہ فوج یہی ہے تو انہوں نے سر ہلا کر کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو سفید نورانی لباس میں ملبوس، گھوڑ سواروں کی فوج تھی جن کے جسم پر کوئی گولی اثر نہیں کرتی تھی۔ ہم نے تو انہی کے خوف سے ہتھیار رکھ دیئے تھے۔ تم تو وہ نہیں ہو؟ یہ اور اسی قسم کے اور افسانے دن رات وضع کئے اور ملک میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ اور سادہ لوح عوام خوش ہیں کہ ہماری کس طرح "غیب سے امداد" ہوئی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جوشش و عساکر کا ذوقِ یقین اور عملِ آہن گداز، ہماری جانباز فضائیہ کی بے پناہ جرأتیں۔ لاہور اور سیالکوٹ کے قابلِ فخر پاسبانوں کی بے مثال قربانیاں۔ چودہ چودہ دن تک خندقوں میں بیٹھ کر چنے کی ایک مٹھی پر گذارہ کر کے آگ اور خون کے سیلابِ بلا انگیز کو روکنے والے مردانِ کارزار کی تحیر انگیز استقامت۔ ان کے یہ تمام درخشندہ کارنامے جن پر خود تاریخ فخر کرے گی، کس طرح تصوراتی سبز پوشوں اور توہماتی گھوڑ سواروں کی گرد میں گم ہوتے چلے جا رہے ہیں —— اور یہ کچھ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ جب جنگ ہنوز ختم بھی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد، ان پر جو کچھ گزرے گی ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حالانکہ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب واہگہ کی سرحد پر دشمن نے اچانک یلغار کر دی تھی اور ہنوز ہماری فوجیں وہاں نہیں پہنچی تھیں تو انہوں نے ان تمام دیہات کو تباہ و برباد کر دیا۔ وہاں کی بیشتر آبادی کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ ہماری عزت و ناموس کو ٹرکوں میں بھر کر لے گئے۔ اس وقت ان مظلوموں کی غیبی امداد نہ ہوئی۔ کسی سبز پیرہن یا سفید پوش نے انہیں دشمن کی دستبرد سے نہ بچایا۔ لیکن جب ہماری فوج وہاں جا پہنچی تو سترہ دن تک دشمن نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی اور وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے اور یوں اہلِ لاہور کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو محفوظ رہی۔ یہ سب کچھ ان جاں فروشوں کے عزم و ہمت کے تصدق ہوا۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے لیکن اس کے باوجود وہ افسانے ہیں کہ پھیلے چلے جا رہے ہیں۔

بظاہر نظر آتا ہے کہ توہم پرستیوں کے یہ تانے بانے عوام (جہال) کی عقیدت مندیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے سے، اس کے پیچھے حقیقت کچھ اور نظر آئے گی۔ ہمارے اربابِ محراب و منبر اور اصحابِ سبحہ و مصلےٰ نے اپنے لئے معاشرہ میں جو مقام از خود پیدا کر رکھا ہے، زمانۂ امن میں اس کا کوئی حریف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سوا، ہر ایک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور حقارت کی نظروں سے

ٹھکراتے رہتے ہیں۔ اور کوئی شخص ان کے خلاف ایک لفظ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں، تعظیم و تکریم کے تمام نذرانے، ان کی طرف سے منہ موڑ کر، مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پہنچنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ "ملا کی اذاں" اور "مجاہد کی اذاں" میں فرق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں ...... "مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست" اور "مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات" صاف الگ الگ دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔ اور ہر گوشے سے ان کی تعریف و توصیف کے غلغلے بلند ہونے لگتے ہیں۔ یہ حضرات (اربابِ منبر و مصلّے) اس کے خوگر ہی نہیں ہوتے کہ اپنے حلقہ سے باہر کسی کی عزت و توقیر برداشت کر سکیں ———— آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات، صحابہؓ تک تو مجاہدین کے کارنامے بیان کرتے ہیں کہ: اپنا شمار انہیں کے حلقہ میں کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد، اس ہزار بارہ سو سال میں، کسی مردِ تیغ آزما کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان کی تعریف و ستائش کے تمام زمزمے علماء و زہاد کے طبقہ تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا، جب جنگ کے زمانے میں، اربابِ تیغ و سناں کی توصیف و تعریف کے چرچے عام ہوتے ہیں —— اور اربابِ تیغ و سناں بھی وہ (فوجی) جن میں یہ مسلسل اٹھارہ برس تک کیڑے ڈالتے چلے آرہے تھے ———— تو یہ نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیرنے کے لئے ایک بڑا لطیف حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کے محیر العقول کارناموں کو "روحانی قوتوں" کی طرف منتقل کر دیا جائے تاکہ ان کا کوئی (CREDIT) ان جانبازوں کے حصے میں نہ آئے۔ تعریف و توصیف ہو تو آسمان سے اُترنے والے، سبز پوشوں اور سبز عمامہ والوں کی، کیونکہ یہ کارنامے درحقیقت انہوں نے سرانجام دیئے تھے۔ اربابِ تیغ و علَم تو محض ان کے آلۂ کار تھے۔ یعنی جس طرح کوئی شخص اس توپ کی تعریف نہیں کرتا جس کے گولوں نے دشمن کو تباہ کیا ہو، بلکہ توپچی کی تعریف کرتا ہے، اسی طرح، اصل تعریف کے مستحق یہ "آسمانی عناصر" قرار پا جاتے ہیں اور خاک و خون میں غلطیدہ، سپاہی، ان کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان خیالات کو اس شد و مد سے پھیلایا جا رہا ہے کہ (اور تو اور) خود ہمارے یہ قابلِ فخر سپاہی بھی ———— جن کی قوتِ ایمان اور جوشِ کردار نے یہ محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے ہیں ...... یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ صاحب! ہمیں خود معلوم نہیں کہ یہ کچھ کیسے ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ایسا کہنے میں اس کسرِ نفسی اور منکسر المزاجی کا بھی دخل ہے جو ایک بلند نگاہ، کشادہ ظرف، صاحبِ عزم و ہمت فاتح کا فطری شعار ہوتا ہے، لیکن ڈر یہ ہے کہ ... اگر یہ عقیدہ بن گیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں ان جواں ہمتوں کے دست و بازو کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سب کارنامے مافوق الفطرت عناصر کے رہینِ منت ہیں، تو یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔ جنگ میں مالِ غنیمت و کشور کشائی، اتنی گراں بہا متاع نہیں ہوتی، جتنی بیش قیمت متاعِ خود آفرینی کی وہ دولت ہوتی ہے جو اس قوم کو میسر آجاتی ہے ———— یعنی وہ قوم جو اپنے آپ کو منکشف (DISCOVER) کر لیتی ہے۔ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ جان لیتی ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے تصور کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ یہ سب کچھ "آسمان سے اترنے والوں" نے کیا ہے، تو وہ اپنی نگاہوں سے بدستور اوجھل رہتی ہے اور آئندہ ایسے

خطرات کے مواقع پر، اسی قسم کی "روحانی تائید" کے انتظار میں بیٹھی، زندگی کے ہر شعبے میں شکست کھاتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کے پیش نظر ہم نے قوم کے سامنے اس حقیقت کا پیش کرنا ضروری سمجھا ہے کہ جو کچھ اس جنگ میں ہوا ہے وہ تمہارے مقصد کی صداقت، تمہارے یقین کی محکمیت، تمہاری استقامت، تمہاری جرأت، تمہارے ایثار سے ہوا ہے۔ اس کا سہرا تمہارے سر ہے۔ تم نے یہ کچھ کیا ہے۔ تم پھر بھی یہ کچھ کر سکتے ہو۔ اسے یہ بتانا مقصود ہے کہ :-

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس کے دل میں اس شعور کا بیدار کرنا مطلوب ہے کہ :-

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اسے اس امر کا یقین دلانا مقصود ہے کہ :-

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

معلوم ہوا ہے کہ حکومت ان کارناموں کا، جو جنگ میں سامنے آئے ہیں، ریکارڈ مرتب کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ یہ بڑا مبارک فیصلہ ہے۔ لیکن ہم حکومت سے گذارش کریں گے کہ :-

(۱) ان داستانوں کو براہِ راست متعلقہ لوگوں سے جمع کیا جائے تاکہ یہ امکانی حد تک صحیح معلومات پر مشتمل ہوں۔

(۲) ان میں مبالغہ آمیز افسانوں کو دخیل نہ ہونے دیا جائے۔ نہ ہی انہیں کسی مافوق الفطرت عنصر کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

(۳) انہیں اس انداز سے پیش کیا جائے کہ یہ بلند ہمت انسانوں کے کارناموں کی حیثیت سے سامنے آئیں اور قوم محسوس کر سکے کہ ہم میں کیا کچھ کر سکنے کی قوتیں پنہاں ہیں۔

(۴) اور اس حقیقت کو واضح انداز میں پیش کیا جائے کہ تائید ایزدی کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ ریکارڈ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے دل میں حیات بخش جذبات اور جرأت آفریں ولولے بیدار کرنے کے لئے مضراب کا کام دیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ڈر ہے کہ قوم کے ان جاں نثاروں کا لہو بہا خون، افسانوں کی سرخیاں بن کر رہ جائے گا اور یوں یہ متاعِ گراں بہا ضائع ہو جائے گی۔

---

(۱) یہ ریکارڈ ہماری نظروں سے آج تک نہیں گذرا۔ (دسمبر ۱۹۷۶ء)

شائع شدہ طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۶۶ء

اِن کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے

(۲)

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کیلئے

ہم نے طلوع اسلام کے نومبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں لکھا تھا کہ حالیہ جنگ میں ہمارے قابلِ فخر مجاہدوں نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ ان کی پامردی، ہمت، شجاعت، استقامت، جانبازی اور جانفروشی کے زندہ مظاہر ہے ہیں۔ انہیں غیبی قوتوں کی طرف منسوب کر کے، انہیں افسانے نہ بنایئے۔ اس سے بڑا نقصان ہوگا ہے لیکن انسان کی اعجوبہ پسندی کچھ ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ اسے حیستاں سرائی اور داستاں گوئی سے ورے تسکین ہی نہیں ہوتی۔ اس کا تقاضا ہے کہ ان افسانہ تراشیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مثلاً (ہفتہ وار معاصر) چٹان کی ۲۹ نومبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل مافوق الفطرت واقعات درج ہیں۔

ایک محاذ پر توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کے بھارتی بھیڑیئے گولہ باری کر رہے تھے۔ پاکستانی مجاہد جوابی کارروائی میں مصروف تھے کہ ایک سفید ریش بزرگ سادہ دیہاتی لباس میں عین مورچہ پر تشریف لے آئے اور توپچی کو گولہ پھینکنے کے لئے نشان دہی کرنے لگے۔ آپ انگشت شہادت سے اشارہ کرتے کہ اس طرف گولہ پھینکا جائے چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق توپ کا زاویہ بدل دیا جاتا۔ اور عجب بات یہ ہے کہ گولہ ٹھیک ٹھیک نشانہ پر لگتا۔ جس کی وجہ سے دشمن کی صفوں میں نہ صرف ابتری پھیل جاتی بلکہ اس سے بھارتی ٹینک اور توپیں بھی برباد و ناکارہ ہو جاتیں، اور آخر کار بھارتی سینا پسپائی پر مجبور ہو جاتے۔ ایک دن پاکستانی میجر کو خیال آیا کہ یہ درویش کون ہیں جو روزانہ محاذ پر رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے دن صبح بزرگ موصوف کو خیمہ میں بلا یا گیا۔ اردلی افسر کا اشارہ پاتے ہی ایستادہ ہو گیا اور سفید ریش بزرگ سے استفسار کیا گیا، آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟ درویش بزرگ نے کچھ جواب نہ دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پانی طلب کیا۔ اردلی پانی لینے کے لئے گیا تو میجر کرسی پر بیٹھنے کے لئے بڑھا، جونہی توجہ دوسری طرف مبذول ہوئی تو میجر نے دیکھا وہ کرسی خالی پڑی ہے جس پر بزرگ تشریف فرما تھے۔ میجر اور تمام لوگ حیران تھے کہ یہ کیا کرشمہ ہے تلاشِ بسیار کے بعد بھی وہ بزرگ پھر اس محاذ پر نظر نہ آسکے۔

پھر تحریر ہے :-

ایک عزیز دوست شرقپور سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ کے دنوں ایک رات مجھے حضرت میاں شیر محمد صاحب کی خواب میں زیارت ہوئی تو آپ کا لباس گرد آلود اور ہاتھ خون سے میلے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت! اس وقت کونسی مصروفیت ہے تو آپ نے اشارۃً فرمایا کہ محاذِ جہاد جا رہی ہے اور مجاہدین کی اعانت فرض ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے :-

ایک صاحب قصور کے رہنے والے ہیں اور ہر ہفتہ حضرت داتا گنج بخش رحؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے ہیں۔ وہ ایک دن حسب معمول مزار پر حاضر ہوئے تو کوشش بسیار کے باوجود صاحب مزار سے کوئی توجہ نہ مل سکی۔ اسی پس و پیش کے عالم میں انہوں نے تین دن تک یہیں قیام کیا آخری رات چند لمحات کے لئے زیارت ہوئی تو حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا کہ محاذ پر مصروف تھا۔ سرکار دو جہاںؐ کے فرمان کے مطابق تمام بزرگان دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے جہاد کا حکم دے دیا گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ :-

روزنامہ حریت کراچی اور مشرق لاہور میں مدینہ منورہ سے ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مکتوب نگار کو آنحضرتؐ کی زیارت ہوئی تو دیکھا کہ حضورؐ گھوڑے پر حرم نبوی کے باب السلام میں بڑی عجلت میں پا بر کاب ہیں۔ آپ کے جلو میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ رسالتمآب فرما رہے تھے کہ پاکستان پر کفار نے حملہ کر دیا ہے اس لئے جہاد فرض ہو گیا اور سواری بڑی تیزی سے روانہ ہوئی۔

اور اسی بدلیہ میں یہ بھی کہ :-

حکیم نیر واسطی لاہور جنگ کے دنوں میں وطن عزیز سے باہر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد جب زیارت روضۂ اطہر کے لئے مدینہ منورہ پہنچا تو وہاں کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدنی نے دوران ملاقات فرمایا کہ ایک رات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ میں نے عرض کیا آپ مجھے تشریف سے کیسے تشریف لے آئے تو فرمایا پاکستان پر کفار حملہ آور ہیں اس حصے وہاں جہاد میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔

اس کے بعد ایک حلفیہ بیان درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

لاہور کی ایک جامع مسجد کے خطیب نے منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر حلفیہ بیان کیا کہ بھارتی فوجوں اور ہوا بازوں کو جب پاکستان کی بہادر فوجوں نے گرفتار کیا تو وہ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ پاکستان کے وہ سبز پوش مجاہد کہاں ہیں کہ ہم جن کے سبب سخت حملہ کرتے تھے۔ لیکن وہ سبز پوش جو آسمان سے اترتے تھے ہمارے حملہ کو ناکارہ بنا دیتے اور ہمیں پسپائی پر مجبور کر دیتے۔ اور انتہا یہ ہے کہ بھارتی ہوا باز پاکستان کے ایک معروف شہر پر تقریباً سو بم گراتے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے اس شہر کے ہوائی اڈے کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا تو یہ اللہ کی رحمت کا کرشمہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

ان "واقعات و مشاہدات" کو درج کرنے کے بعد، صاحبِ مضمون رقمطراز ہیں :-

الغرض ایسے لاتعداد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ خود اللہ تعالےٰ نے لڑی ہے۔ اور خالقِ کون و مکان کے محبوب پیغمبر سرورِ کائنات کے فیض و برکت سے فتح پذیر ہوئی ہے۔

ہم ان حضرات سے باادب دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مخالف یہ اعتراض کر دے کہ :-

آپ کے عقیدہ کے مطابق یہ جنگ خود اللہ تعالےٰ نے لڑی ہے۔ اس میں حضور نبی اکرمؐ۔ حضرت علیؓ۔ داتا گنج بخشؒ۔ میاں شیر محمد شرقپوریؒ۔ اور دیگر اولیاء کرامؒ۔ بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اور سرکارِ دو جہاںؐ کے فرمان کے مطابق تمام بزرگانِ دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے۔

تو پھر یہ کیوں ہوا کہ قصور پر بمباری ہوئی اور وہاں کی بے گناہ مہتی آبادی تباہ و برباد ہو گئی۔ پشاور کے گرد و نواح کے دیہات دشمن کی گولہ باری کا نشانہ بن گئے۔ مرید کے اور نارنگ کے قریب چلتی ٹرینوں کے مسافر بچارے، بم سے اڑ گئے۔ اعوان شریف پر دشمن کے گولوں نے آگ برسا دی اور کتنا ہی نقصان ہو گیا۔ سیالکوٹ میں گولہ باری نے تباہی مچا دی۔ سلامت پورہ کی بستی گولوں کا نشانہ بن گئی۔ لاہور اور سیالکوٹ سیکٹر میں سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہمارا کتنا ہی علاقہ دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔

تو آپ کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے ؟ جو جنگ خود خدا لڑے کیا اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے ؟ اور آگے بڑھئے۔ پاکستان نے یہ جنگ کشمیر کے مظلوموں کی حفاظت اور ان کے جائز حقوق کے استرداد کے لئے لڑی تھی۔ لیکن خود کشمیر میں دشمن نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اور جس طرح معصوم بچوں۔ بے گناہ عورتوں۔ مظلوم بوڑھوں۔ نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل ہی نہیں کیا جا رہا بلکہ انہیں زندہ جلایا جا رہا ہے۔ گاؤں کے گاؤں نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی بے محابا عصمت دری کی جا رہی ہے۔ جو قتل ہونے سے بچ جاتے ہیں انہیں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ملک بدر کر دیا جاتا ہے ——— یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا[1]؟ ذرا سوچئے کہ یہ اعتراض بڑی گہری سوچ کا متقاضی ہے۔

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ :-

بعض غزواتِ اسلامیہ میں صحابہ کبارؓ نے رسول اللہؐ سے سوال کیا کہ میدانِ جنگ میں ایسے مجاہد بھی برسرِ پیکار نظر آتے ہیں جنہیں ہم پہچان نہیں سکتے۔ تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آسمانی مخلوق ملائکہ مقربین تھے جو مسلمانوں کی طرف سے کفار کے ساتھ نبرد آزما تھے۔

---

[1] اور اس کے ساتھ اس اعتراض کو بھی ملا لیجئے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں یہ حضرات کہاں تھے جو ہماری مدد کو نہ پہنچے اور ہمیں اس قدر فاش شکست ہوئی۔ (ستمبر ۱۹۷۸ء)

لیکن قرآنِ کریم نے جہاں ان ملائکہ کا ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی تصریح کر دی ہے کہ : لَمْ تَرَوْهَا - (۳۳ : ۹ ؛ ۴۸ : ۹) - تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے (اس لئے کہ ان کا مشن لِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ - ۳ : ۱۲۵ - دلوں کو اطمینان بخشنا تھا)۔ قرآن کریم کی اس تصریح سے واضح ہے کہ یہ روایات جو اوپر درج کی گئی ہے (کہ صحابہ رضؓ نے ان ملائکہ کو دیکھا تھا) صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ قرآن مجید کے بیان سے ٹکراتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر ہماری حالیہ جنگ میں "ملائکہ کا نزول" ہوا بھی تھا تو وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ لہٰذا، وہ تمام "مشاہدات" جن میں کہا گیا ہے کہ لوگوں نے ان مافوق الفطرت قوتوں کو انسانی پیکروں میں دیکھا، ذہن انسانی کے تخیلات سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتے۔

ان افسانوں کا جو حوصلہ شکن اثر ہمارے جواں ہمت مجاہدوں پر پڑ رہا ہے اس کا ذکر (اسی اشاعت میں) دوسری جگہ کیا گیا ہے۔ (دیکھئے۔ پاکستان کی نئی زیارت گاہیں) بنا بریں، ہم تمام متعلقہ حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ ہمارے ان جانفروش مجاہدوں کے کارناموں کو افسانے نہ بننے دیں اور انہوں نے جو معرکے سر انجام دیئے ہیں ان کا سہرا انہی کے سر باندھیں۔ جہاں تک تائیدِ خداوندی کا تعلق ہے، اس کا صحیح قرآنی مفہوم ہم اس سے پہلے بالوضاحت لکھ چکے ہیں۔

شائع شدہ طلوع اسلام بابت جنوری [illegible]

پاکستان کی نئی زیارت گاہیں

(۱)

(پرویز)

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی شام، جبکہ سورج کی، خونِ شفق میں ڈوبی ہوئی کرنیں، واہگہ کے لالہ زار کو الوداعی سلام کہہ کر رخصت ہو رہی تھیں، میں، چند احباب کی معیت میں باٹا پور فیکٹری سے باہر، نہر کے کنارے کھڑا تھا۔ سامنے، نہر کے پل کی شکستہ سلیں پانی میں سرنگوں تھیں اور پانی این و آں سے بے پرواہ، نہایت خاموشی سے آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اسے اس کا بھی علم و احساس نہیں تھا کہ وہ کس طرح پاکستان کی تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکا ہے۔ ——— اشیائے فطرت کی کیفیت ہی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات انسانی تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتی ہیں لیکن اس کا (CREDIT) خود نہیں لیتیں۔ ان کے برعکس یہ حضرتِ انسان ہے جس کی حالت یہ ہے کہ: يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا۔ (3/188) یہ ان کاموں کے لئے بھی اپنی تعریف چاہتا ہے جنہیں اس نے سرانجام نہیں دیا ہوتا ——— میں اس نہر کے کنارے خاموش کھڑا تھا اور میرے پردۂ تصوّر پہ ماضی کے نقوش ایک رنگین فلم کی طرح ابھرتے چلے آ رہے تھے ——— اکثر ایسا ہوا کہ اتوار کے دن، درس کے بعد ہم نہر باری دوآب کے کنارے کنارے، سیدھے واہگہ کی سرحد تک چلے گئے۔ راستہ میں یہ بڑی نہر (لنک کینال) بھی پڑتی تھی۔ اُس وقت یہ بات کبھی حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آئی تھی کہ یہ نہر جسے ہم محض حسینِ مناظر کی جولانگاہ سمجھ رہے ہیں، ایک دن پاکستان کا باب السلام۔ ہماری ہر متاعِ حیات کی محافظ و پاسبان۔ سرزمین لاہور کے لئے حصنِ حصین، اور ترجمہ ملت کی رگِ حیات بن جائے گی۔ پھر، میرے سامنے ۱۴ اگست کی دوپہر کا وہ منظر بھی تھا جب واہگہ کی سرحد پر، ان اوقت کچھ کے ہنگامہ کے بعد، ہندوستان اور پاکستان کے قیدیوں کے تبادلہ کی ایک غیر رسمی لیکن مؤثر اور عبرت انگیز تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اور جب ہمارے ایک قیدی کے بدلہ میں، ہماری طرف سے ہندوستان

گئے تھے، قیدی چھوڑے جا رہے تھے تو اس وقت ہمارے دلوں میں پاکستان کی عظمت و برتری کا احساس کس قدر گرم جوشی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے کسٹم کالونی کی حسین اور مصفا عمارت تھی جہاں مستورات سے ہماری نہایت بے تکلفانہ تواضع ہوئی تھی۔ میرے سامنے وہ منظر آیا جب دسمبر سے ایک ہی ہفتہ پہلے، ہم ستلج رینجرز کے کمانڈر میجر علیم کی دعوت پر، شام کے وقت، جھنڈے اتارنے کی خاموش اور پُر وقار تقریب دیکھنے کے لئے سرحد کے پھاٹک تک گئے تھے ——— خلوص اور محبت کا پیکر میجر علیمؒ ایک باغ و بہار شخصیت!..... واپسی پر رات ہو گئی تو جلو موڑ کی دو رویہ دکانیں، جہاں پہلے آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا، جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سب کچھ میری نگاہوں کو دامانِ باغبان و کفِ گل فروش بنا رہا تھا کہ یکایک اس فلم کا دوسرا سین سامنے آگیا۔ نہر کے اُس پار، جلو موڑ کی ساری آبادی ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تا حدِ نگاہ ہولناک خاموشی اور قبرستان کا سا سکوت تھا۔ انسان تو ایک طرف کوئی چرند پرند بھی دکھائی نہیں دیتا تھا ——— حسین، شاداب کسٹم کالونی ویران ہو چکی تھی۔ نہر سے اِس طرف چند قدموں تک، لیکن اُس پار، دور دور تک کھنڈرات ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے ——— میجر علیمؒ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق مختلف قیاسات تھے۔ انہوں نے جس جانبازانہ ہمت اور مجاہدانہ شجاعت سے، بھارتی فوج کے اچانک شبخون کو تنہا روکا تھا، اس کے متعلق پختہ خبریں وجۂ نشاط و فرح ہو رہی تھیں۔

لیکن اس کے بعد ان پر کیا گزری، اس کے متعلق کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ——— گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ حیاتِ جاوداں کی ہزار عشرت سامانیاں اپنے جلو میں لئے فِي جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴/۵۵) شادکام و کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں ——— وہ جہاں بھی ہیں، خدائے ذو المنن کے سحابِ کرم کی لا انتہا بارشیں ان پر گہر باری کریں۔

میں انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ہمارے مورچوں کے قریب، ایک جوانِ رعنا، میجر کی پُرشکوہ وردی میں ملبوس، کڑی کمان کے تیر کی طرح آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ چہرہ نہایت شگفتہ و شاداب۔ ایسے افسردہ و پژمردہ ماحول میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے صحرا میں لالہ کا پھول کھلا ہو۔ پاس سے گزرا تو ہمارے ساتھ کھڑے میجر...... کو دوستانہ سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ لیکن چند قدم جانے کے بعد لوٹا اور آ کر ہم سب سے نہایت محبت اور خلوص سے ملا۔ کہا کہ معاف فرمائیے! سامنے جھاڑی کی ایک جنبش نے میری توجہ کو اس قدر جذب کر رکھا تھا کہ میں رک نہ سکا۔ اب اطمینان کے بعد واپس آیا ہوں۔ باتیں تو چند ہی کیں لیکن انہی سے اس کا حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار آئینے کی طرح سامنے آگیا ——— اقبالؒ کے تصور کا ایک جیتا جاگتا مرقع کہ :ـ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری!

اتنے میں مجھے نہر کے اُس پار، کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ یہ تین سکھ سپاہی تھے جو ریت کی خود ساختہ دیوار کے پیچھے بھارت کے ترنگے جھنڈے کو سنبھالے کھڑے تھے۔ میں نے میجر صاحب سے پوچھا کہ یہ اتنے قریب ہیں کبھی کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سُن کر اس جیالے سپاہی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ —— کہنے لگا۔ بریگیڈ صاحب! آپ بدتمیزی کہتے ہیں؟ اگر یہ کبھی ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھیں تو خدا کی قسم یہیں کھڑے کھڑے ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ مفتوحہ علاقہ پر اپنا جھنڈا گاڑے کھڑے ہیں۔ اس احساس سے سپاہی کا سر آسمان کو چھو جانا چاہیئے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ وہ کس قدر افسردہ و پژمردہ کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی نے شیر کے سامنے بکری باندھ رکھی ہو۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ محض فائر بندی کی ڈھال ہے جس کے پیچھے انہیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ ورنہ زندگی ان کے نصیب میں کہاں؟ —— وہ یہ کہہ رہے تھے اور مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں ابھی بندوق کی لبلبی نہ دبا دیں۔

اتنے میں میرے احباب نے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔ ہم نے رخصت چاہی تو اس ایریا کے کمانڈر نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ چائے کا پیالہ پیئے بغیر کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ ہم نے ہزار معذرت چاہی لیکن سپاہی کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے؛ بٹالین کے اندر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ وہاں زبردستی لے گئے۔ دروازے کے باہر، ایک مگر مچھ نما بم پڑا تھا۔ کہنے لگے، اس سے ذرا ہٹ کر آیئے گا۔ یہ دشمن کا "ان پھٹا" بم ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر آگیا کہ: ؎

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی!

انہوں نے، اس ویرانے میں، ایسی بے سرو سامانی کے عالم میں، بڑی محبت سے چائے پلائی۔ چائے کے دوران گفتگو میں نہر کے پل کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے کہ اس کی داستان بڑی لرزہ انگیز اور ساتھ ہی حوصلہ افزا ہے۔ —— ۶ ستمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب، دشمن اِس پل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیچھے امرتسر تک، سپاہ کا ایک سیلاب بلا انگیز ٹھاٹھیں مارتا ہوا آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ان کے جلو میں تھا۔ ان کے اور پاکستان کے درمیان یہی ایک پل تھا۔ عام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ ہم نے اس پل کو فوراً توڑ دیا اور یوں لاہور محفوظ ہو گیا۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ پل شام کے ساڑھے چار بجے تک نہیں ٹوٹا تھا، ایک مرتبہ کوشش کی تو اس میں صرف دراڑیں پڑیں۔ آپ سوچیئے کہ یہ وقت کس قدر نازک تھا۔ اس ذرا سے ٹکڑے پر مسلسل دس گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ ہمارے دلوں میں یہ احساس قیامت برپا کر رہا تھا کہ اگر ایک دفعہ دشمن نے اس پل کو عبور کر لیا تو پھر اس کا مسمار کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔ اور اس کے بعد جو کچھ لاہور پہ گزر سکتی تھی اس کے تصور سے آج روح کانپتی ہے اس احساس نے پل کے اس طرف جانبازوں کی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی۔ اور اس دیوار نے دشمن کے سیلاب بے پناہ کے روکنے میں جو کچھ کر دیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ کے اوراق پیش کر سکیں مسلسل دس

گھنٹے تک یہ صبر آزما کشمکش جاری رہی۔ تاآنکہ ہمارے قابلِ صد افتخار، جانباز سپاہی، میجر آفتاب نے واقعی ہتھیلی پر سر رکھ کر، اسے توڑ ڈالا۔ فوج نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور دشمن خاسر و نامراد، منہ تکتا رہ گیا۔ یہ ہے وہ پُل جس کی ٹوٹی ہوئی سلوں پر، اِن سرفروشوں کی داستانِ عظمت، اَن مٹ حروف میں نقش ہو چکی ہے۔ اولٓئک علیھم صلوٰت من ربھم و رحمۃ و اولٓئک ھم المفلحون (۲/۱۵۷)

ہم باہر نکلے تو معلوم کیوں .... ترنگے جھنڈے پر میری نگاہ بلاشعور جا پڑی۔۔ — پاکستان کی سرزمین پر بھارت کا جھنڈا! — دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت — میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ کمانڈر نے دیکھا تو میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ مت گھبرائیے۔ چند دنوں تک اسے برداشت کر لیجئے۔ جس دن فائر بندی کا حکم واپس لیا گیا اس دن آئیے گا اور پھر دیکھئے گا کہ اس جھنڈے کی دھجیاں کس طرح فضا میں اڑ رہی ہیں — اور اتنے میں، میں مشورہ دوں گا کہ آپ کھیم کرن ہو آئیے۔ تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی آپ کے سامنے آ جائے۔

کھیم کرن

چنانچہ ۲۱ر اکتوبر کی شام ہم کھیم کرن کے محاذ کی طرف گئے۔ قصور سے جب شاہراہ چھوڑ کر، ہم کھیم کرن کی طرف مڑے ہیں تو سب سے پہلے پھر اُسی نہر کو سلامی دی جسے میں نے ابھی ابھی پاسبانِ پاکستان اور بابُ السلام کہہ کر پکارا ہے۔ نہر کو پار کیا تو سامنے ایک وسیع و عریض میدان تھا جس میں بھارت کے شکستہ ٹینک یوں بکھرے پڑے تھے جیسے ڈھور ڈنگروں کے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ اس سے یہ نظر آیا کہ دشمن ایک وقت میں یہاں تک بڑھ آیا تھا۔ تھوڑی دور آگے گئے تو پاکستان کی سرحد ختم ہو گئی اور اب ہمارے قدم اس سرزمین پر تھے جسے ہم نے بھارت سے فتح کر کے حاصل کیا ہے۔

اس مقام پر، یک لخت، اٹھارہ سال پہلے کا ایک ایسا واقعہ اُبھر کر شعور کی سطح پر آ گیا جو اس سے پہلے کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے وقت، جب میرا دہلی سے روانہ ہونے کا دن آیا، تو دفتر کے ہم عصر ہندوؤں نے مجھے الوداعی پارٹی دی تھی — یہ قوم بھی عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ یہ مجھے "پس پشت" اور "نگا" (اورنگ زیب کا سکھایا شاہی حقارت آمیز تلفظ) کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پارٹیاں بھی دیا کرتے تھے۔ اور پھر پارٹی بھی ہندوستان کو چھوڑتے وقت! یاللعجب! پارٹی کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ایک بے تکلف ہمکار نے کہا کہ "چوہدری صاحب! پھر دہلی کب آؤ گے؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "جب دہلی فتح کر لیں گے"۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے اس اٹھارہ برس میں سرزمینِ ہند پر قدم تک نہیں رکھا۔ اور آج پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین کے اس رقبے پر قدم رکھا جسے ہم نے فتح کیا۔ یہ واقعہ یاد آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں کے تلوے سے ایک لہر اٹھی ہے اور برقِ تپاں بن کر رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ جذبۂ تشکر سے میرا سرِ نیاز بدرگاہِ ربُ العزت جھک گیا۔

اب راستے میں رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لئے تیزی سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کھیم کرن کے سامنے

تھے۔ ہمارے سامنے کھیم کرن نہیں تھا۔ عبرت و موعظت کی ہزار داستانوں کا مرقع تھا۔ ایک ایسی بستی جو ابھی چند دن پہلے پندرہ بیس ہزار نفوس کا جیتا جاگتا مسکن تھی، اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کا کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس پر چھت موجود ہو۔ کوئی دیوار ایسی نہیں تھی جو صحیح و سالم کھڑی ہو۔ کوئی دروازہ یا دریچہ ایسا نہ تھا جو جل کر کوئلہ نہ ہو گیا ہو۔ وہاں وحشت ہی نہیں دہشت کا کیا عالم تھا، آپ اس کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ ساری بستی میں کوئی سانس لینے والا ابھی نہ تھا۔ بڑا ہی ڈراؤنا منظر تھا۔ اکثر مکانات پرانے زمانے کی چھوٹی اینٹوں کے قلعہ نما محل تھے جس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ قصبہ قدیم زمانے سے آباد چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب اس کے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر یہ منقوش تھا کہ:۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝ (۲۲/۴۵)

کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ کر دیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے ظالم تھے۔۔۔ ان میں اب کوئی بھی نہیں بستا۔ وہ اس طرح اجڑی ہوئی ویران پڑی ہیں کہ ان کے کنوئیں بیکار ہو چکے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مستحکم قلعے اور محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

اس لئے فاعتبروا یا اولوالالباب۔

کھیم کرن سے دو تین میل اور آگے بڑھے تو اس مقام پر پہنچ کر رک گئے جہاں سے آگے جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ تھوڑی دور آگے ہندوؤں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں سے ہماری سرحد سامنے نظر آ رہی تھی۔ اِدھر ہمارے سپاہی۔ اُن کے سامنے دو گز کے فاصلے پر دشمن کی فوج کا دستہ۔ درمیان میں کوئی حفاظتی دیوار نہیں!

اس مقام پر ایک نوجوان کماندار تھا ۔۔۔۔۔ غالباً صوبیدار ۔۔۔۔۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا کہ وہ ۶ ستمبر کی صبح اس محاذ پر آ گیا تھا۔ ساری جنگ لڑی۔ دشمن کو دھکیلتا ہوا یہاں تک لے آیا۔ اور اس دن کے بعد اس وقت تک یہیں مقیم ہوں۔ اس محاذ کی داستان بیان کرنے والا اس سے زیادہ ثقہ راوی اور کون ہو سکتا تھا۔ اس نے چشم دید واقعات سنائے ۔۔۔۔ وہ واقعات سنا رہا تھا اور ہم دم بخود ساکت و صامت کھڑے دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ! اب بھی تیرے بندوں میں ایسے جری اور بے باک موجود ہیں جو اس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں؟۔۔ یقیناً اسی آدم کی اولاد ہیں جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز تھے۔

میں نے اس سے کہا کہ صوبیدار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ ۶ ستمبر کی صبح سے [illegible] مسلسل لڑتے رہے۔ اس دوران میں کھانے پینے کا کیا رہا؟ یہ سُن کر اس نے میری طرف عجیب حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ میاں صاحب! کھانا پینا بیکار وقت کا مشغلہ [illegible] ہمیں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ چنوں کی پوٹلیا میرے پاس تھی۔ تین دن تک چارہ کی بندھی رہ گئی۔ نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی ختم ہی بھری رہی

میں نے کہا کہ ہمارے (وہ) اگلے سپاہی، دشمن کے سپاہیوں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ہیں۔ وہ (دشمن کے سپاہی) تعداد میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی شرارت تو نہیں کرتے؟ ــــ کہنے لگے کہ ہاں! وہ ان سے چھ گنا زیادہ ہیں۔ لیکن صاحب! ہماری قسمت کہاں کہ وہ کوئی شرارت کریں۔ ان کم بختوں سے تو غلطی سے بھی کوئی فائر نہیں ہوتا۔ ہم تو تنگ آگئے۔ آپ ہی سوچئے۔ کب تک کوئی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے!

اس میدان میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ فضا پر وحشت طاری تھی۔ یہ حالت دن میں تھی۔ رات کو یہاں کس قدر خوفناک تاریکی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ــــ میں نے کہا ــــ صوبیدار صاحب! آپ لوگوں کو تنہائی نہیں ستاتی۔ یہ سُن کر اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسی آواز سے جس میں اعتماد کی پوری قوت جھلک رہی تھی، کہا کہ تنہائی! یہ آپ نے کیا کہا۔ ہم تنہا نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ دس کروڑ پاکستانیوں کی دعائیں ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں نہ کبھی اداس ہونے دیتی ہیں نہ مایوس۔ ہم کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ آپ سب بھائی ہمارے ساتھ ہوتے ہیں ... ۔ہم تو جیتے ہی آپ کے سہارے ہیں۔

وہ یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ہاتھ چومے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں ان میں خوشی کے آنسو تھے۔

شام ہو رہی تھی۔ ہم نے بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے وہاں سے کچھ تحائف اکٹھے کئے ــــ ٹوٹے ہوئے ٹینکوں کے ٹکڑے۔ چلے ہوئے کارتوس۔ توپ کے گولوں کے خول۔ ان سے بڑھ کر اور کیا تحائف ہو سکتے تھے!

راستے میں شام ہو گئی تو سڑک کے کنارے کچھ سپاہی کھانا لے کر بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام کیا تو وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو گئے کہ صاحب! کھانا کھا کر جائیے۔ ہم نے بڑی معذرت کی اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے ہم ابھی گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ جنگل میں ہیں آپ کھانا کھائیے۔ لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ کھانا الگ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب تک آپ شریک نہیں ہوں گے ہم نہیں کھائیں گے۔ اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو۔

اس ان پڑھ سپاہی نے نہایت سادگی سے یہ الفاظ کہے اور نہ معلوم مجھے کہاں سے کہاں لے گیا۔ میں نے جی میں کہا کہ اے کاش! یہ بات کہیں ہماری سمجھ میں آجائے تو آج ہی دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اسلام یہی تو کہنے آیا تھا کہ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو!

سپاہی مصر تھے۔ ہم حیران۔ کہ ان کے کمانڈر نے مفاہمت کی راہ نکالی اور ہم سے کہا کہ صاحب! آپ ایک ایک لقمہ لے لیجئے۔ یہ اس کے بغیر نہیں کھائیں گے۔

وہ ایک لقمہ میرے لئے حاصلِ زیست تھا ـــــ ایک مردِ مجاہد سے ہم نوالہ ہونے کی سعادت ـــــ
جاں تذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

چونڈہ

جنگ کے ان محاذوں کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک میدانِ کارزار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے اس امر کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے جانفروش مجاہدوں نے کس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس جنگ میں سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جو بے پناہ مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور ہمارے کوہ پیکر نوجوانوں نے جس بے جگری اور سرفروشی سے اس کا مقابلہ کیا تھا، اس کی داستانوں کی گونج مدت تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس لئے اس محاذ کو بھی دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن محاذ پر جانے کا فائدہ اسی صورت میں ہے کہ کوئی فوجی افسر ساتھ ہو ـــــ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا ـــــ ہماری خوش بختی سے، اس محاذ پر ہمارے دو قرآنی دوست تعینات تھے۔ ان کے حسنِ توسط سے ہماری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ ۲۰ نومبر کی صبح ہم اس محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ڈسکہ کے مقام پر، ایک قرآنی رفیق ملک ضیاء اللہ صاحب کا مکان سڑک کے کنارے واقع تھا۔ انہوں نے زورِ حسنِ تواضع، ناشتہ کے لئے روک لیا۔ تنہا ناشتہ کی کشش تو شاید ہمارے لئے عناں گیر نہ ہوتی لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی بچیوں نے جس معصومانہ انداز سے ہمارا پرتپاک استقبال کیا، اس نے نہ صرف یہ کہ ہمیں آگے بڑھنے نہ دیا بلکہ ہم وہاں کافی دیر تک رکے رہے۔ کس قدر خوش بخت ہے وہ گھرانا جس کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو۔

طے یہ تھا کہ ہمیں پسرور کے ریلوے اسٹیشن پر، فوجی راہ نما مل جائیں گے تاکہ ہم بآسانی آگے جا سکیں۔ ڈسکہ میں جو ہمیں کچھ دیر ہوگئی تو ہم نے دیکھا کہ ان رہنماؤں کی جیپ پسرور سے ڈسکہ کی طرف چلی آرہی ہے ـــــ اور جیپ میں سپاہی نہیں تھے ـــــ خود ہمارے معزز میزبان تھے ـــــ اس گرم جوشی سے ملے کہ ان کے سینے کی حرارت نے ہمارے عروقِ جامد میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ کس قدر صحیح کہا تھا حکیم الامت نے کہ:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہاں سے ہم سیدھے چونڈہ گئے ـــــ جسے سیالکوٹ کی ٹینکوں کی جنگ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت چونڈہ کے کے میدان میں لڑی گئی تھی ـــــ ہمارے قومی ترانوں میں چونڈہ کا نام ضرور آنا چاہیئے تھا۔ ـــــ قصبہ بے آباد تھا۔ اس کے باہر ایک ٹیلہ پر چڑھے تو سامنے وہ وسیع و عریض میدان تھا جس میں یہ محیر العقول اور عدیم النظیر معرکہ سر ہوا تھا۔ جمعوں کے اطراف سے نیچے اتریئے تو سامنے میلوں لمبا چوڑا میدان ہے ـــــ بالکل ہموار ـــــ

نہ کوئی ٹیلہ نہ چٹان۔ نہ ندی نہ نالہ۔ حتیٰ کہ درخت بھی کہیں کہیں اکا دکا کھڑے تھے۔ اس قسم کا میدان ٹینکوں کی لڑائی کے لئے بڑا سازگار ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ دشمن نے اس یورش کے لئے اسی میدان کو منتخب کیا تھا۔ وہ پہلے ہلّہ میں پونڈہ تک پہنچ چکا تھا ــــ شہر اور ریلوے اسٹیشن اس کے قبضہ میں تھا ــــ کہ ہمارے جانباز وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے پھر جو کچھ کر کے دکھایا، آسمان کی آنکھوں نے کاہے کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہوگا۔ تعداد میں کہیں کم۔ ساز و یراق کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسرے محاذوں پر لڑنے کے بعد یہاں پہنچے ہوئے ــــ تھکے ماندے ــــ لیکن عقاب کی نگاہیں اور چیتے کا جگر لئے ہوئے، خدا کی اس صفت کے مظہر کہ ــــ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ۔ (۲/۲۵۵) نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند ــــ ہمارے دونوں میزبان دوست (جو اعلیٰ افسر ہیں) .... شمشیر بکف اور کفن بدوش اس محاذ کے اندر تھے۔ انہوں نے، ایک ایک مورچہ پر پہنچ کر جو "آپ بیتی" سنائی ہے تو باور کیجئے، ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے ہیں ــــ لیکن اس "آپ بیتی" میں اپنے کارناموں کا ذکر محض برسبیلِ تذکرہ، اور وہ بھی انتہائی انکسار کے ساتھ۔ سارا (CREDIT) اپنے رفقاء کو دیتے ہوئے ــــ اور رفقاء کا یہ عالم کہ وہ رہ رہ کر ہمارے کانوں میں کہتے چلے آتے تھے کہ یہ سب کچھ انہوں نے خود کیا تھا، ہمارا اس میں کوئی حصّہ نہیں۔ کیسی حسین و دل کش تفسیر تھی یہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ کی (کہ مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ ہماری فوجوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، آپ کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس کے وجوہ و علل تو بہت سے ہیں، لیکن ان میں ایک عنصر ایسا ہے جو میرے نزدیک بڑا اہم ہے۔ لڑائی کا عام نقشہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے آگے پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے چھوٹے افسر۔ جوں جوں پیچھے ہٹتے جایئے، افسروں کا درجہ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً سب سے آگے کیپٹن۔ اس کے پیچھے میجر۔ پھر کرنیل۔ پھر بریگیڈیئر۔ حتیٰ کہ جرنیل کا مورچہ یا ہیڈ کوارٹر، محاذِ جنگ سے میلوں پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ہماری تعداد بہت کم ہے۔ ہم نے لڑائی کا نقشہ الٹ دیا۔ ہم نے افسر اور سپاہی کا امتیاز اٹھا دیا۔ چنانچہ افسر اگلی صفوں میں سپاہیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے۔ ہمارے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک زخمی افسر کو بچانے، حتیٰ کہ ایک افسر کی لاش کو دشمن کے قبضے سے چھڑانے کیلئے بیسیوں سپاہی اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ان سپاہیوں نے جب دیکھا کہ افسر خود ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں تو انہوں نے، ان سے بھی آگے بڑھ کر موت کو گلے لگایا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے افسروں کی اموات (شہادت) کی نسبت اس قدر زیادہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ اور یہی وجہ درحقیقت ہماری اس قدر حیرت انگیز کامیابیوں کی ہے۔

ہمارا دوست یہ کچھ بیان کر رہا تھا اور میرے سامنے قرآن کریم کے اس مقام کے رموز و اسرار ایک

ایک کرکے کھلتے جا رہے تھے جہاں اس لئے کہا ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) جنگ احزاب میں، مسلمان فوج پر (قرآن کے الفاظ میں) "ایسا سختی کا وقت آگیا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے اُمنڈ کر آ گئے تھے۔ خوف کے مارے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، اور دہشت سے ان کے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آ پہنچیں گے۔"

ایسے حوصلہ شکن اور ہمت طلب حالات میں، ان کا کمانڈر (یعنی حضور نبی اکرمؐ) بہ نفس نفیس ان کے شانہ بشانہ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور دشمن کی یلغار کی تلاطم انگیزیاں اس کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ یہ تھا وہ مقام جہاں ان مجاہدوں سے کہا گیا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

کس قدر حسین تھا وہ نمونہ جو تمہارے رسول نے تمہارے لئے پیش کیا تھا۔

اور حضور رسالتمآبؐ کے اسی اسوۂ حسنہ کا اتباع تھا جس نے ہماری حالیہ جنگ میں لڑائی کا نقشہ الٹ دیا تھا ——— میں یہ کہہ رہا تھا اور میرے دوست کے چہرے پر مسرتوں کی سرخی پھیل رہی تھی۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر باعثِ مسرت و امتنان اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کا قدم حضور رسالتمآبؐ کے اتباع میں اٹھا اور اس کا ایسا خوشگوار نتیجہ سامنے آیا ——— میرے دوست نے فخر و مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا کہ "آپ نے آج کس طرح ہماری نگاہوں کا رخ پھیر دیا ہے۔ میرے رفقائے ہم عنان کو آپ کے اقدام کی اس درخشندہ تعبیر سے کس قدر خوشی ہو گی!"

ہم اس میدان کے ولولہ انگیز ماحول میں پھر رہے تھے، اور جس مقام پر کوئی محیر العقول کارنامہ سامنے آتا تھا، ان مجاہدوں کے لئے، جن میں سے کچھ اس وقت بھی ہمارے ساتھ ہی تھے، میرے لب پر بے ساختہ زمزمۂ تبریک و تہنیت آ جاتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان افسر تھا۔ بڑا تیز اور ذہین۔ اس نے مجھ سے کچھ رازدارانہ انداز سے، آہستہ سے کہا کہ مجھے ایک بات بتائیے۔ آپ ہمارے ان کارناموں پر، قدم قدم پر ہماری تعریف و توصیف کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ غیب کی قوتوں نے کیا۔ ہمارا نشانہ ٹھیک لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گولہ ہمارے توپچی نے نہیں پھینکا تھا، کسی سبز پیرہن بزرگ نے پھینکا تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دے کر، دشمن کو پسپا کیا تو وہ ہم نے نہیں کیا، سفید گھوڑیوں پر سوار روحانی فوج نے کیا۔ جب یہ سب کچھ ان غیبی قوتوں نے کیا تو اس میں ہمارا (CREDIT) کیا ہے! میں نے دیکھا کہ اس کی اس تنقید میں طنز سے کہیں زیادہ ملال، اور افسردگی کا پہلو نمایاں تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اُف! یہ افسانے (جنہیں خواہ بطور سازش پھیلایا گیا ہو یا بر بنائے جہالت) کس قدر حوصلہ شکن نتائج پیدا کر گئے ہیں۔ ہمارے وہ جانباز مجاہد جنہیں اپنے کارناموں پر، فخر سے سر اٹھا کر چلنا چاہیئے تھا، ان افسانوں سے ان کے دل بجھ گئے ہیں...

یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر طلوع اسلام نے یہ کہا تھا کہ:

ان حقیقتوں کو افسانے نہ بننے دیجئے

مجھے بتایا گیا کہ ان سپاہیوں نے یہ کچھ صرف اخبارات میں نہیں پڑھا - ہمارے جو بزرگ ان محاذوں کو دیکھنے آئے ہیں، انہوں نے بھی ان سے یہی کچھ کہا ہے - اور اس سے ان پر غیر شعوری طور پر بڑا حوصلہ شکن اثر ہوا ہے -

میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ عزیزم! ذرا اتنا سوچو کہ اگر یہ کارنامے ان غیبی قوتوں نے سرانجام دیئے ہیں تو پھر "نشانِ حیدر" میجر عزیز بھٹی (شہید) اور "ہلالِ جرأت" ملک اختر کو کیوں دیا جا رہا ہے؟ نوجوان بڑا ذہین تھا - ایک ثانیہ میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا - اور کہنے لگا کہ پھر قوم میں یہ (DUAL PERSONALITY) کیوں کارفرما ہے؟ میں نے کہا کہ اس کے متعلق بڑی تفصیل ہے، فرصت کے وقت بات کروں گا -

اور یہ فرصت مجھے اس وقت مل گئی جب ہم میس کے باہر، دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھے - اس مجلس میں، افسر بھی تھے اور جوان بھی - اس سے پہلے، فوجیوں کے اس قسم کے ریمارکس بھی مجھ تک پہنچ چکے تھے کہ ہم سترہ برس تک کامل، اپنے اہلِ وطن کے طعن سنتے رہے - کوئی کہتا کہ یہ فوجی مفت میں بیٹھے قوم کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش اڑا رہے ہیں - کہیں سے آواز آتی کہ ان سے نہریں کھدوایئے - کوئی کہتا ان سے سڑکیں کٹوایئے - پچھلے دنوں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو ملک میں ایسے کہرام مچ گیا گویا فوج نے قوم کو لوٹ لیا ہے - ہم یہ سب کچھ سنتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے - اس لئے کہ جب تک کوئی معرکہ سامنے نہ آئے، فوج کیا بتا سکتی ہے اور کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے - خدا خدا کر کے یہ موقع ملا کہ ہم اپنی ہستی کا جواز، اور اپنے مقام کی اہمیت کا مظاہرہ کر سکیں - ہم نے ایسا کیا اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اہلِ ملک نے، جنگ کے دوران، اس کا دل کھول کر اعتراف کیا - لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی، یہ حکایتیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ یہ سب کچھ غیبی قوتوں کی وجہ سے ہوا ہے - فوج کا اس میں کیا ہے؟ اس سے ہم پھر اسی مقام پر آ گئے جہاں پہلے تھے -

میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا - اس لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ضروری خیال کیا کہ اس باب میں قرآنی حقیقت کو ان کے سامنے پیش کر دوں - چنانچہ میں نے ان سے تفصیل سے باتیں کیں جن کا انداز کچھ اس قسم کا تھا -

"عزیزانِ من! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کے پروگرام، غیبی قوتوں سے نہیں، بلکہ انسانی ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں - قرآن کریم میں دیکھئے - جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی ہے وہاں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش اور مستبد لوگوں کی روک تھام کیلئے انسانوں کی جماعتیں اٹھ کھڑی ہوں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے - آپ نے دیکھا کہ دنیا میں مستبد قوتوں کی روک تھام کا انتظام انسانی جماعتوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے - اور دیکھئے! مکہ کے مظلوم اپنی حفاظت کے لئے خدا سے فریاد کرتے ہیں، اور خدا، مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کمزور و ناتوان، مظلوم کس طرح بلک بلک کر ہم سے مدد مانگ رہے ہیں - تم ان کی امداد کے لئے

کیوں نہیں اٹھتے؟ آپ نے دیکھا کہ خدا ان مظلوموں کی امداد کے لئے کوئی غیبی قوت نہیں بھیجتا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم

ان کی مدافعت کے لئے اٹھو۔

یہی وہ مجاہد ہیں جن کے متعلق وہ (خدا) کہتا ہے کہ یہ لوگ خوف و ہراس کے حوصلہ شکن حالات میں نہایت پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑے رہتے ہیں اس لئے ہم ان پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتے ہیں ..... (اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ) اس کے برعکس، ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی سپاہی، میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان تمام مقامات میں آپ نے دیکھا کہ میدانِ جنگ میں فتح و کامرانی کا سبب، ان مجاہدین کے ثبات و استقامت اور جانبازی و سرفروشی کو قرار دیا جاتا ہے نہ کہ کسی غیبی قوت کو۔ اور اسی کے لئے انہیں اس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان مجاہدین سے کہا تھا کہ اگر تم میں بیس سپاہی بھی جم کر ثابت قدمی سے مقابلہ کریں گے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ اس میں دیکھئے کہ دشمن کے دو سو سپاہیوں کو مغلوب کرنے کے لئے بیس ثابت قدم مجاہدین کی ضرورت لاینفک قرار دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی مقابلہ کے لئے کھڑا نہیں ہوگا تو بھی دشمن کے (کم از کم) ایک سو اسّی سپاہی ہماری غیبی قوتوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر ان بیس کے لئے استقامت اور ثبات کی شرط ضروری سمجھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساز و سامان کی موجودگی بھی۔ کیونکہ وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت پورے ساز و سامان کے ساتھ ہے۔ سردست، جب تم میں ساز و سامان کی مقابلتہً کمی ہے، تم اپنے سے دوگنی تعداد پر بالضرور غالب آجاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بھی تاکید کر دی کہ تم اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے خوب مستحکم رکھو۔ (اس زمانے میں بہترین استحکام کا یہی ذریعہ تھا)۔ یہ نہیں کہا کہ تم میدانِ جنگ میں چلے جاؤ۔ تمہاری سرحدوں کی حفاظت غیبی قوتیں کریں گی۔ اس لئے یاد رکھیئے! اس جنگ میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے، وہ آپ کی اور صرف آپ کی ہمتوں کا صدقہ ہے۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر ہے۔ اس میں کسی "سبز پیرہن یا سفید قبا" والے کا کوئی دخل نہیں۔ آپ قوم کے نزدیک بھی درخورِ صد تعریف و ستائش ہیں اور خدا کے ہاں بھی مستحق ہزار درجات و مناصب۔"

میں یہ کہہ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر سرخی دوڑتی جا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی ہے اور ان کے سینوں میں تازہ ولولے بیدار ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ایک مجاہد نے (جو ذرا زیادہ عمر کا تھا) پوچھا کہ جس چیز کو تائید خداوندی کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کے متعلق بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالےٰ دنیا میں ہر کام کیلئے قوانین مقرر کر دیتے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نفع بخش اور کامیابی کا ضامن

ہوتا ہے۔ اسے تائیدِ خداوندی کہتے ہیں۔ یہ قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک قانون تو یہ ہے کہ جب آپ توپ کا رُخ ٹھیک کر کے، صحیح زاویہ کے مطابق، عین وقت پر گولہ چلائیں گے تو وہ ٹھکانے پر لگے گا۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ آپ عدل اور انصاف کی خاطر جنگ کریں گے۔ آپ کا مقصد مظلوموں کی امداد ہوگا۔ اور آپ جنگ میں بلند اخلاق کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جائیں گی جن سے آپ کا ایک ایک سپاہی، دس دس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں "خدا کی راہ میں لڑنا" اس طرح لڑنے والوں کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی اللہ کا لشکر کہا ہے۔ اور اس جنگ کو خدا کی مدد کرنا" قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ: وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ (۲۲/۴۰) "خدا یقیناً اس کی مدد کریگا، جو خدا کی مدد کرے گا" یعنی جو لوگ ان مقاصد کی خاطر جنگ کریں گے جنہیں خدا نے اچھا قرار دیا ہے، اور جنگ میں ان امور سے مجتنب رہیں گے جن سے اس نے روکا ہے، تو انہیں ایسی جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ قلب نصیب ہوگا جس سے ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے زیادہ ہو جائیں گے اور خطرات کے مقابلہ کے وقت ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس کا نام تائیدِ خداوندی ہے۔ لیکن یاد رکھیئے! اگر آپ "توپ کے گولے والے" قانون میں غلطی یا سستی کر جائیں گے تو اس کا نقصان ہو کر رہے گا۔ جنگِ اُحد میں، نبی اکرمؐ سپہ سالارِ اعظم تھے اور صحابہ کبارؓ سپاہ۔ یہ لشکر حق و صداقت کے لئے میدان میں نکلا تھا اس لئے انہیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جب ان کے ایک دستہ نے ذرا سی غلطی کی تو ان کی فتح شکست میں بدل گئی۔ (اور تو اور) خود نبی اکرمؐ کو بھی زخم آئے۔ کسی غیبی قوت نے انہیں، اس غلطی کے نقصان سے نہیں بچایا۔ حق کی خاطر لڑنا اور توپ کا رُخ صحیح رکھنا، اس سے جو خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں انہیں تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کرنے کا بھی سارا (CREDIT) مجاہدین کو ملتا ہے۔ ان مجاہدین کو جن کے ہاتھوں خدا کے پروگرام تکمیل تک پہنچتے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ؎

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ایک نوجوان نے کہا کہ روحانی قوت بالآخر ہوتی ہی ہے نا! میں نے کہا کہ ہاں ہوتی ہے، لیکن وہ مجاہد کے دست و بازو میں ہوتی ہے۔ یہی وہ دست و بازو تھے جن کی حیرت انگیز قوت کو دیکھ کر خود خدا نے کہا تھا کہ "میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے۔ تم تلواروں کا وار نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے۔" یاد رکھیئے! ——— ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ——— آپ نے غور نہیں کیا کہ خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والے گرد و غبار کی قسم کھائی ہے۔ ان کے نعلوں سے اُبھرنے والی چنگاریوں کی قسم کھائی ہے۔ کسی "روحانی قوت" کے مدعی کے تسبیح و مصلّے کی قسم نہیں کھائی۔ اس لئے مجاہد کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ان قرآنی بصائر کا نتیجہ تھا کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہاں کی فضا بدل چکی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد، مجھے جو خط موصول ہوا اس میں تحریر تھا کہ:۔

> اس رجمنٹ کے سب افسران اور جس جس جوان سے آپ ملے نہایت متأثر ہوئے۔ ان کا (MORALE) تا بفلک جا پہنچا۔ (دوبارہ) جنگ سے پہلے کہیں آپ سے دو چار باتیں سن لیں تو کم از کم اس یونٹ کے جوان بخوشی سر دھڑ کی بازی لگا لیں۔

مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ فالحمد للہ۔

جنگِ اُحد میں جب مسلمان مجاہدین کو اپنی ایک غلطی سے شکست ہوئی تو اس کا ان کے دل پر بُرا اثر ہوا۔ اس بددلی کے ازالہ کے لئے قرآن کریم نے ان سے کہا کہ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو اس سے پہلے اس قسم کا زخم تم فریقِ مخالف کو لگا چکے ہو۔ یہ جنگ کا میدان ہے اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت، کسی غلطی یا لغزش سے، وقتی طور پر شکست ہو جائے تو اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ دوسرے وقت میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

واہگہ کی سرحد پر اپنا کچھ نقصان دیکھ کر مجھ پر جو کچھ تھوڑی سی افسردگی طاری ہوئی تھی، اس کا ازالہ، کھیم کرن کا محاذ دیکھنے سے ہو گیا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر ہمارا کچھ علاقہ دشمن کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اس کا ازالہ کرنے کے لئے مجھ سے کہا گیا کہ اب تم چھمب کا محاذ دیکھ آؤ۔ کھیم کرن میں اگر تمہیں " قَرْحٌ مِّثْلُهٗ " نظر آیا تھا تو چھمب میں تمہیں قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا۔ (۳/۱۶۴) دکھائی دے گا۔ یعنی جس قدر نقصان دشمن نے تمہیں پہنچایا ہے۔ تم اس سے دگنا نقصان اسے پہنچا چکے ہو۔ اور اگر راجستھان کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو پھر دشمن کا نقصان ہم سے چار گنا ہو جاتا ہے۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر

چنانچہ ۲۲ دسمبر کی دوپہر ہم چھمب کے سیکٹر کی طرف روانہ ہوئے۔ رات جلالپور جٹاں میں گزاری۔ پروگرام تو یہی تھا کہ وہاں خاموشی سے رات گذار کر آگے چلے جائیں گے۔ لیکن شدہ شدہ قرآنی احباب کو اطلاع مل گئی تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ اس طرح قرآن کی باتیں بھی ہو گئیں اور بہت سے قدیمی دوستوں سے ملاقات بھی۔ جن تعلقات کی بنیاد خیر خلوص قرآنی رشتہ پر ہو، ان میں جس بے لوث محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے، اس کی مثال کسی اور رشتے میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ مختصر سی محفل اسی جذبہ کی حسین یادگار تھی۔ اس پر ہمارے میزبان عزیز میر عبدالغنی صاحب اور محترم مرزا غلام حسین صاحب کا حسن تواضع ـــــ وجہ نشاطِ قلب و نظر تھا۔ اس پر سرور فضا میں رات بسر ہوئی اور ۲۳ کی صبح ہم جانبِ منزل روانہ ہو گئے۔

جلال پور جٹاں سے قریب دس میل کے فاصلہ پر (بمقام ٹانڈہ) ہمارے فوجی رہنما مل گئے ـــــ ایک

نہایت ذہین، پُرخلوص اور شگفتہ مزاج فوجی ڈاکٹر جن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس محاذ کی پوری جنگ میں وہ بذاتِ خود شریک تھے۔ اس لئے وہ راستہ بھر "فوج بیتی" نہیں بلکہ (یوں کہئیے) کہ آپ بیتی سناتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوجی معرکہ آرائی کا صحیح اندازہ وہی اس وقت سکتا ہے کہ میدان کارزار آپ اپنے قدموں سے ناپیں۔ اور حدی خواں وہ ہو جس نے اس معرکہ میں خود حصہ لیا ہو۔ ٹانڈہ سے تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ سڑک کے کنارے ایک طرف، سرخ حروف میں نوشتہ ایک کتبہ نظر آیا جس پر لکھا تھا

" LIBRATET AREA "

میری نگاہیں ان حروف پر تھیں۔ اور آسمان پر ندائے آسمانی کی یہ نشید جاں افزا کہ: وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا۔ (۳۳/۲۷) اس نے تمہیں ان دشمنوں کی زمینوں کا، ان کی بستیوں کا، ان کے مال و دولت کا وارث بنا دیا۔ اور اس سرزمین کا بھی جس پر ہنوز تمہارے قدم نہیں پڑے تھے۔ ایک طرف یہ جذبات اور احساس اور دوسری طرف اس کتبہ کے الفاظ کا حسنِ انتخاب، جو گذشتہ اٹھارہ سال کے ماجرات کی منہ بولتی تصویر تھے ؎

میری نگاہ نے جھک جھک کے کروائے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

تھوڑی دور آگے چھمب کا ویران شدہ قصبہ تھا، جس تھانے میں ہماری پولیس تھی۔ اس تھانے کی تصاویر، اس علاقہ کی فتح کے ساتھ، سب سے پہلے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ اب وہ خود ہمارے سامنے تھا۔ اندر گئے تو تھانے کے انچارج پولیس افیسر نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ چائے کی پیشکش کی۔ لیکن آگے بڑھنے کی شدتِ اشتیاق نے معذرت خواہی پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ یہاں سے جوڑیاں، جو ہمارے سفر کی آخری منزل تھی۔ بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن ہمارے عزیز مہمان نے، بہ کمالِ شفقت کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پورے راستہ کو دیکھیں جس سے ہماری فوجیں گذر کر جوڑیاں پہنچی تھیں۔ تاکہ سارے محاذ کا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔ اور سفر کے بعد جا کر اس کا احساس ہوا کہ یہ ہمارے اس رفیقِ محترم کا خلوص تھا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا ـــــ وہ راستہ جس کا طے کرنا ـــــ لانا تھا جوئے شیر کا ـــــ ورنہ اگر وہ ہمیں سیدھے جوڑیاں لے جاتے۔ تو ہم پھر بھی ان کے شکر گذار ہوتے۔ لیکن اس طرح ہم وہ کچھ کھو دیتے، جسے ہم شاید دوبارہ نہ پا سکتے۔

اس راستے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہم قریب ساٹھ میل کی مسافت طے کر کے جوڑیاں پہنچے تھے۔ اس تمام سفر میں بیشتر حصہ ایسا تھا جس میں سڑک تو ایک طرف نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ نشانِ راہ۔ سارا راستہ پہاڑی نالوں کے بڑے بڑے پتھروں سے پٹا پڑا تھا۔ جن پر سے جیپ گزرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے زلزلہ آرہا ہے۔ پھر ان پتھروں میں سرو قد سرکنڈے کے "جنگل" ـــــ واقعی جنگل۔ جن میں چار قدم تک بھی نگاہ صاف نہیں جا سکتی تھی۔ یہ تھا ہماری فوجِ ظفر موج کا محاذِ جنگ ـــــ تھوڑی دور آگے گئے تو ہر جہاں

کی سطح مرتفع پر دشمن کا پہلا مورچہ نظر آیا۔ مورچہ کیا تھا۔ ایک زمین دوز چھاؤنی تھی۔ لیکن اب اس کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔

راستہ کے پتھروں سے ٹکراتے اور سرکنڈے کے جنگل کو چیرتے ہوئے آگے گئے۔ تو سامنے پہاڑی پر، دشمن کے پختہ مورچوں کے باقیات دکھائی دیئے۔ اور نیچے ایک وسیع آبادی کی شکستہ، سرنگوں عمارات، جن میں اِدھر اُدھر فوجی بکتر بند گاڑیوں کے ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیوا کی چھاؤنی تھی۔ جو دشمن کا بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس مقام پر ان سے سخت تصادم ہوا تھا۔

ان کھنڈرات میں، ایک طرف ایک چوکھنڈی کے اندر، ایک مزار تھا۔ کم از کم پینتیس چالیس فٹ لمبا۔ اس کے سرہانے "پیر کافی شاہ" کندہ تھا۔ اور چاروں طرف تازہ جلی ہوئی موم بتیوں کے باقیات اس حقیقت کے غماز کہ یہ خانقاہ اب مرجع انام بن رہی ہے۔ اس قسم کی گولہ باری میں اس کا محفوظ رہ جانا ـــــ مدفون پیر صاحب کی کرامت کی زندہ شہادت بن جانے کے لئے کافی تھا۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں توہم پرستی کے خالق اسی قسم کے اتفاقی حادثات ہوتے ہیں۔ اور پھر مرورِ زمانہ سے یہی اتفاقات اور ان سے منسلک خود تراشیدہ افسانے کرامات بن جاتے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھے تو دریائے توی کے کنارے منڈیالہ کراسنگ پر پہنچے۔ اس مقام پر بھارتی ایک بہت بڑا پل بنا رہے تھے۔ اس کی بنیادوں کے ستون ہمارے سامنے کھڑے تھے اور تعمیر کا باقی سامان کنارے پر پڑا ہر راہ رو سے کہہ رہا تھا کہ:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

دریائے توی یوں تو ایک پہاڑی نالہ ہے۔ لیکن اس کا خشک پاٹ بتا رہا تھا کہ برسات کے دنوں میں ایک سیل بے پناہ بن جاتا ہوگا۔ ہمارے جیوش خدا مست نے اسے ستمبر کے شروع میں عبور کیا تھا۔ اسے پار کیا تو سامنے وہ سڑک (پہاڑی راستہ کہیئے) تھی۔ جو جوڑیاں کی طرف جا رہی تھی۔ چند میل آگے بڑھے تو دور سے پہاڑی کے اوپر ایک قدیم قلعہ نظر آیا۔ اسے قلعہ کلیت کہتے ہیں۔ دروازے پر لفٹننٹ کرنل شیو رام سنگھ (مارچ ۱۹۳۳ء) لکھا تھا ـــــ مارچ ۱۹۳۳ء کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کیونکہ قلعہ کی عمارت تو سینکڑوں برس پرانی دکھائی دیتی تھی۔ قلعہ کے اوپر چڑھے تو اس کے محلِ وقوع کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس وقت مطلع ابر آلود تھا۔ ورنہ (کہتے تھے کہ) وہاں سے گجرات، سیالکوٹ، جموں تک کی آبادیاں نظر آجاتی تھیں۔ اب بھی ہمارے سامنے بیسیوں میل کا علاقہ تھا۔ قلعہ کی پوزیشن ایسی تھی کہ اس پر اگر ایک سپاہی مشین گن لے کر کھڑا ہو جائے۔ تو نیچے کتنی ہی فوج ہو، کسی کو قریب تک نہ آنے دے۔ لیکن ہمارے عساکر کے سیل رواں کے سامنے یہ قلعہ بھی ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط ثابت نہ ہوا ـــــ یقینِ محکم اور عزمِ راسخ دنیا میں کیا کچھ کر دکھاتا ہے!

اس سے ذرا آگے بڑھے تو سامنے جوڑیاں کا ویران شدہ قصبہ تھا۔ جس کے ڈاک بنگلہ میں اب ہمارا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ لیکن جوڑیاں تک پہنچنے سے پہلے ذرا رکیئے۔ اور دیکھیئے کہ وہ سامنے کیا نظر آتا ہے؟ یہ ٹرڈی کی

پہاڑی ہے جس پہ یہاں سے وہاں تک چاروں طرف تین تین منزل کے پختہ مورچے تھے۔ یہ مورچے دشمن کا قلعہ تھے جس کے دامن میں جوڑیاں کا قصبہ تھا۔ اس پہاڑی کے نیچے سے گذر کر جوڑیاں کو فتح کرنا۔ اور پھر اس سے آگے اکھنور تک جا پہنچنا۔۔۔۔۔ کم از کم ہمارے ذہن میں تو نہیں آسکتا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ ہم اس ورطۂ حیرت میں گم تھے کہ ہماری جیپ ڈاک بنگلہ کے احاطہ میں جا پہنچی۔ وہیں آفیسرز میس تھا۔ ہم نے جہاں بھی اپنے جیالے نوجوانوں کو دیکھا۔۔۔۔۔ وہ افسر تھے یا جوان ـــــ انہیں ہر جگہ شگفتہ و شاداب پایا۔ مجھے کہیں کسی ایک جگہ بھی کوئی ایسا فوجی نظر نہیں آیا جو افسردہ یا تنگ مزاج ہو۔ اس دن بی بی سی لندن کا ایک نمائندہ بھی بغرض سیاحت وہاں آیا ہوا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے ساتھ گفتگو میں گذرا۔ خوراک کے مسئلہ پہ بھارت کے واویلے کا ذکر آیا تو ایک افسر نے کہا کہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب ہم نے اس مقام (جوڑیاں) پر قبضہ کیا ہے تو یہاں شہری گوداموں کے اندر اس قدر فاضلہ غلہ پڑا تھا۔ جو ان کے دو تین سال تک بھی ختم نہ ہوتا۔۔ (یہی کچھ ہم نے چھمب کرن میں سنا تھا) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بھارت کی چیخ و پکار کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ شہری آبادی کا ذکر آیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے قبضہ کرنے سے پہلے یہ قصبہ خالی ہو چکا تھا۔ البتہ یہاں تیس چالیس بوڑھے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ یعنی ان کے عزیز رشتہ دار خود تو جان بچا کر بھاگ گئے۔ اور اپنے ان سن رسیدہ بزرگوں کو پیچھے دشمن کے حوالے کر گئے ـــــ بعینہٖ یہی کچھ ہم نے چھمب کرن میں سنا تھا۔ اس سے آپ ہندو قوم کی ذہنیت کا اندازہ لگائیے۔ عقیدہ ان کا یہ ہے کہ مہاراج رام چندر نے اپنے پتا کے بچن کا پالن کیا۔ (یعنی اپنے والد کے دیئے ہوئے قول کو نبھایا)۔ تو وہ ایشور کے اوتار ہو گئے۔ اور عمل ان کا یہ ہے کہ بھاگتے وقت اپنے بوڑھے والدین کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماں باپ تو ایک طرف ۔۔۔ گائے کی حالت یہ ہے کہ یہ گائے کو ماتا کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے۔ لیکن اس ماتا کے ساتھ ان کا سلوک یہ ہوتا ہے کہ (ہم ہندوستان میں دیکھا کرتے تھے کہ) جب تک وہ دودھ دیتی اسے اپنے پاس رکھتے۔ لیکن جونہی وہ بوڑھی ہو جاتی اسے یا تو دوسروں کی نظر بچا کر قصابوں کے ہاتھ بیچ دیتے۔ اور یا گھر سے باہر نکال کر آوارہ چھوڑ دیتے۔ جو قوم اپنے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ وہ عام انسانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کرے گی ظاہر ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، ہم جوڑیاں کے اجڑے ہوئے قصبہ کو دیکھنے گئے۔ قصبہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن برباد شدہ عمارات کے کھنڈرات بتا رہے تھے کہ یہاں کے رہنے والے اچھے خوشحال ہوں گے۔ لیکن چھمب کرن کی طرح یہ قصبہ بھی وجعلنٰھم احادیث کا عبرت انگیز مرقع تھا۔ یعنی ان بستیوں کی اب صرف داستانیں باقی رہ گئی تھیں۔ دور سے سڑک کے کنارے وہ مسجد(1) دکھائی دی جس کی بابت اخبارات میں اکثر پڑھا تھا۔ بتایا گیا کہ یہ بڑی خستہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کے حسن عقیدت اور

---

(1) یہ وہی مسجد تھی جس کے متعلق ہندوستان نے شور مچایا تھا کہ پاکستانی افواج نے صبح آٹھ بجے بمباری کی اور مسجد میں نمازیوں کو ہلاک کر دیا۔ اوّل تو آٹھ بجے دن کے کوئی نماز ہی مسجد میں نہیں ہوتی۔ اور پھر اس مسجد میں تو موچی بیٹھا جوتے گانٹھا کرتا تھا۔

جوشِ عمل نے اسے اب بڑی پاکیزہ عمارت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس مقام سے آگے قریب چار میل تک ہمارا قبضہ ہے لیکن فائربندی کے سلسلہ میں ہندو جس انداز سے معاہدہ کا "احترام" کر رہا ہے اس کے پیشِ نظر، اب سیاحوں کو آگے نہیں جانے دیا جاتا۔ ہمارے زیرِ قبضہ علاقہ سے آگے قریب تین میل سامنے اکھنور کا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ہم نے اپنے جاں فروش سپاہیوں سے اکھنور کے معرکے کے تفصیلی حالات سنے۔ انہیں اکھنور سے ادھر رک جانے کا اس قدر افسوس تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا ذکر آتے ہی وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے لیکن جس بے تابانہ نظر سے وہ اکھنور کی سمت دیکھتے ہیں اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک بندھے ہوئے شیر کی طرح اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ فائربندی کی آہنی زنجیر کھول دی جائے تو یہ جموں سے ورے دم ہی نہ لیں۔ وہ یہ سننے کے لئے مضطرب و بیتاب نظر آتے تھے کہ فائربندی کے احکام کب واپس لئے جائیں گے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــ سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا۔

دن ڈھل رہا تھا اس لئے ہمیں واپس آنا پڑا۔ اگرچہ جی نہیں چاہتا تھا۔ واپسی اس راستے سے ہوئی جو سیدھا چھمب تک جا پہنچتا ہے۔ صاف، سیدھا، ہموار راستہ۔ نہ کہیں ٹیلے نہ پتھر۔ نہ ندی نالے نہ سرکنڈا۔ سارا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب۔ وادیٔ کشمیر میں جو کچھ نورجہاں کے دستِ حنائی اور جہانگیر کے ذوقِ رعنائی نے کیا ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے، تو شادابی اور دلکشی میں یہ علاقہ اس سے کم نہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے اس سے بھی زیادہ جاذب کہ یہاں ہر طرف آموں کے پیڑ ہیں۔ جو وادی میں نہیں ملتے۔ آم تو اس سارے علاقہ میں بڑی افراط سے پھیلا ہوا ہے۔ راستے میں کھوڑ اور پلاں والا کی بھارتیوں کی تباہ شدہ چھاؤنیاں دیکھیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اٹھارہ سال سے مسلسل جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس حسین و شاداب علاقہ کی لطف اندوزی سے ابھی دامنِ نگاہ پُر بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم دریائے توی پار کر کے چھمب کے تھانے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں ذرا رکیئے اور دو اہم نکات پر نگاہِ بازگشت ڈالیئے۔

ایک تو یہ کہ اس سیدھے راستے سے ہماری فوجیں گھنٹہ بھر میں جوڑیاں تک پہنچ سکتی تھیں۔ انہوں نے اس راستے کو چھوڑ کر وہ راستہ کیوں اختیار کیا جس کی دشوار گذاریاں اس قدر ہمت طلب اور حوصلہ شکن تھیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرف سے آتے ہوئے اس بین الاقوامی حدِ فاصل (باؤنڈری لائن) کو توڑنا پڑتا تھا جسے قائم رکھنے کا پاکستان عہد کر چکا تھا۔ دوسری طرف آزاد کشمیر کا علاقہ تھا۔ جس میں اس قسم کی کوئی پابندی ہم پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کشمیر کی افواج ادھر سے بڑھ رہی تھیں۔ اور ہم ان کی مدد کے لئے پہنچے تھے۔ اس

۱؎ ہمیں بتایا گیا کہ یہ رک جانا اس لئے تھا کہ لاہور کی حفاظت کا تقاضا تھا کہ وہاں کی فوجوں کو فی الفور اس طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر یہ فوری ضرورت لاحق نہ ہوتی تو اس وقت نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ لاہور کی حفاظت کے لئے ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ موقعہ آنے پر اہلِ لاہور اس قرض کو بحسن و خوبی ادا کریں گے۔ یہ احسان فراموش نہیں ہیں۔

سے آپ اندازہ لگائیے کہ پاکستان بین الاقوامی معاہدات کا احترام کس طرح کرتا ہے۔ ہندو ہمارے علاقے کے اندر اعوان شریف کے گاؤں پر بمباری کر چکا تھا۔ اب کونسا امر مانع تھا کہ ہماری افواج سیدھی ان کے علاقہ میں نہ چلی جاتیں لیکن ہم نے اس پر بھی ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی طرف سے معاہدات کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اور دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس محاذ پر ہماری فوجوں نے جو محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے اس کی مثال بھی تاریخ میں شاید ہی کہیں اور ملے۔ چھمب سے لے کر جوڑیاں تک ہم نے ہر مقام پر دیکھا کہ دشمن کے مورچے پہاڑیوں اور بلند ٹیلوں پر تھے۔ اور ہماری فوجیں نشیب کی طرف سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جو شخص فنونِ جنگ سے کچھ بھی واقف نہ ہو۔ وہ بھی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان حالات میں مقابلہ کس قدر مشکل، اور معرکہ کس قدر جرأت آزما تھا۔ لیکن ہماری فوجوں کو کسی ایک مقام پر بھی شکست نہیں ہوئی۔ وہ دلیرانہ آگے بڑھتی گئیں اور دشمن بھیڑ بکریوں کی طرح ان سے آگے آگے انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگتا چلا گیا۔ اکثر مقامات پر اس طرح کہ توپ میں گولہ ڈالا ہوا ہے لیکن اسے توپ داغنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ یا اس کا ہوش نہیں رہا۔ اور وہ اسے ویسے کا ویسا چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔ دیوا کا پہاڑی مورچہ، منڈیالہ کراسنگ کا حصنِ حصین، کلیت کا سربفلک قلعہ، ٹروٹی کی پہاڑیوں کے تین تین منزلہ پختہ مورچے۔ سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک بار پھر وہ معرکۂ کہن تازہ ہو گیا۔ جس کے ضمن میں قرآن نے کہا تھا کہ: قذف فی قلوبھم الرعب (اس نے دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا۔) اور جو گروہ موت کے ڈر سے بے خوف ہو کر آگے بڑھے گا اس کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل دہل جائیں گے۔ اسی کا مظاہرہ اس محاذ پر ہوا۔ اور یہ سب کچھ تین چار دن کے اندر ہو گیا۔ حالانکہ ایسا طویل اور فراز طلب راستہ اتنے عرصہ میں بحالتِ اطمینان بھی بمشکل پیدل طے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محاذ کو دیکھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ہر چند ساز و یراق اور شمشیر و سنان بھی جنگ کے لئے لاینفک ہے۔ لیکن فیصلہ کن ہاتھ ان انسانوں ہی کا ہوتا ہے جو اس سامان اور اسلحہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں وہ انسان (فوجی سپاہی) موجود ہیں جن کا مقابلہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور سپاہی کر سکے۔ پاکستانی افواج کے شیر دل مجاہدو! قوم کو آپ پر بجا طور پر ناز ہے۔ تم زندہ و سلامت ہو تو پاکستان ہر خطرہ سے محفوظ و مامون ہے۔ اللہ تمہیں زندہ و سلامت رکھے۔ تم جہاں بھی ہو، دس کروڑ انسانوں کی حسین تمنائیں اور تابندہ آرزوئیں تمہارے ہم رکاب ہیں!

دیدۂ بینائے قوم علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" — ان محاذوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نم، قرآنی اقدار کے پاک اور صاف زندگی بخش چشمہ کے سوا اور کہاں سے مل سکتا ہے۔ خدا ہمیں اس چشمۂ حیات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کی سعادت نصیب کرے۔

والسلام!

شائع شدہ طلوعِ اسلام - بابت مارچ ۱۹۶۶ء

"پاکستان کی نئی زیارت گاہیں"

(۲)

(پرویز)

جنوری ۱۹۶۶ء کے طلوعِ اسلام میں، پاکستان کے مختلف محاذوں کے متعلق میرے چشم دیدہ احوال اور تاثرات شائع ہوئے تو اکثر مقامات سے یہ تقاضے موصول ہوئے کہ مجھے بقایا دو محاذ ——— فاضلکا اور راجستھان سیکٹر ——— بھی دیکھنے چاہئیں بلکہ، فاضلکا سیکٹر کی طرف سے تو اس قسم کے شکوے بھی سننے میں آئے کہ وہاں جو معرکہ سرزد ہوا تھا۔ وہ، اگر زیادہ نہیں تو دیگر مقامات کی معرکہ آرائیوں سے کسی صورت میں بھی کم نہیں تھا لیکن، بایں ہمہ، نہ اس کا کہیں تذکرہ ہوا ہے نہ قومی ترانوں میں اس کا نام تک آیا ہے۔ اس طرح قوم اس سیکٹر کی اہمیت سے واقف ہی نہیں ہو سکی۔ اس سے اس سیکٹر کی اہمیت میری نگاہوں میں اور بھی بڑھ گئی اور ۵ر فروری ۱۹۶۶ء کی صبح ہمارا قافلہ اس طرف روانہ ہو گیا۔ قریب دس بجے صبح ہم قصور اوکاڑہ ریلوے اسٹیشن پر تھے۔ جہاں ہمارے میزبان ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہم سیدھے ہیڈ سلیمانکی گئے جو وہاں سے ۱۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سیکٹر کی اہمیت کا نقطۂ ماسکہ یہی مقام ہے۔ یہاں دریائے ستلج سے تین بڑی بڑی نہریں نکلتی ہیں جو ہزاروں مربع میل پر پھیلے ہوئے علاقہ کے لئے رگِ حیات ہیں۔ "ہیڈ ورکس" ایک عظیم پراجیکٹ اور فنِ انجینئری اور آب رسانی کا شاہکار ہے۔ بھارت اُسے، تقسیمِ ہند کے وقت، کسی نہ کسی طرح پاکستان کو دے تو بیٹھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت سے اس کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سابقہ جنگ میں بھی یہی مقام اس کا ہدف تھا۔ پہلے تو تقسیم کی حد ہیڈ ورکس سے بالکل ملحق تھی لیکن سن ۱۹۶۰ء کے معاہدہ کی رو سے قریب ایک میل آگے بڑھ گئی۔ اس علاقہ کی سیاحت کے بعد یہ حقیقت اور بھی اُبھر کر سامنے آئی کہ ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن کتنی بڑی سازش تھی اور اس کا ایوارڈ ہمارے ساتھ کتنا بڑا فریب کر گیا ہے۔ اس حد بندی کی رو سے ہم قدم قدم پر بھارت کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور اس سینکڑوں میل پر مشتمل علاقہ میں ہمارے لئے کوئی فطری حصارِ حفاظت (لائن آف ڈیفنس) موجود نہیں ہے۔

۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح لاہور پر حملہ ہوا۔ اور ۷ر ستمبر کی صبح، ہیڈ سلیمانکی پر متعین ہماری حفاظتی فوج کو معلوم ہوا کہ بھارت ایک لشکرِ جرار لئے اس سمت بڑھے چلا آرہا ہے، اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ دس بجے

شب ہیڈ ورکس پر ہلہ بول دیا جائے۔ اُس وقت اِس پورے علاقہ میں، پاکستان کی صرف تین بٹالین فوج تھی اور وہ بھی ایسی جس کے پاس نہ ٹینک تھے نہ طیارہ شکن توپیں۔ اُدھر سے دشمن کے کم ازکم تین بریگیڈ، ساز و سامان سے لیس سیلابِ بلا کی طرح اُمنڈے چلے آرہے تھے۔ ادھر حالات ایسے تھے کہ ہماری اس مختصر سی فوج کو کہیں سے کمک نہیں پہنچ سکتی تھی ـــــ کمک کہاں سے پہنچتی۔ قریب ترین فوجی اڈہ لاہور تھا اور لاہور اس وقت خود موت اور حیات کی کشمکش میں تھا۔

آپ ان حالات کو سامنے رکھئے اور پھر اس فوج کی اُس کمان کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جس کی طرف دشمن آتش فشاں پہاڑ کی طرح بڑھتے چلا آرہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کمان نے کیا فیصلہ کیا؟ بھارت کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشن نے اس سے چند ہی روز قبل کہا تھا کہ "سب سے بڑی مدافعت، حملہ کر دینا ہے"۔ اس کمان نے کہا کہ مہاراج! آپ نے سچ فرمایا ہے۔ دیکھئے! عملی تجربہ آپ کے اس قول کی کس طرح شہادت دیتا ہے ـــــ یہ کہا اور صرف دو اڑھائی سو سپاہیوں کے ساتھ، سات بجے شام آگے بڑھ کر، دشمن کے اس جمِ غفیر پر حملہ کر دیا۔ اور دس بجے رات تک (جب دشمن نے اپنے منصوبہ کے مطابق اِن پر حملہ کرنا تھا انہوں نے) ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جہاں دشمن نے حملہ کرنے کے لئے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ جب یہ وہاں پہنچے ہیں تو وہاں ہنوز ان کے چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی اور گرم گرم دال اور چاول کی دیگچیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا اور بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا ـــــ اور اس تاریک رات میں، آسمان کے ستارے، پاکستانی فوج کی کمان کے اس حیرت انگیز، ہوش رُبا، حوصلہ آزما، وہمت طلب فیصلے، اور ان سپاہیوں کی بے مثال شجاعت اور عدیم النظیر بسالت کی داد دے رہے تھے۔ دس بجے شب، پاکستانی فوج کے چند عقبی دستے ان کے ساتھ اور آملے۔ اور اب انہوں نے مدافعانہ کی بجائے جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے۔ آپ ذرا تصوّر میں لائیے اس منظر کو کہ اتنے بڑے وسیع و عریض رقبہ پر پھیلے ہوئے محاذ پر، چند سو سپاہی اور وہ بھی (مقابلتہً) ایسے مختصر سے اسلحہ اور سامان کے ساتھ، دشمن کی اس قدر کثیر تعداد کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائے چلے جا رہے تھے۔ دوسرے دن شام تک یہ کئی میل آگے بڑھ چکے تھے۔ فاضلکا کا ڈپو ان کی گولہ باری سے تباہ ہو چکا تھا۔ دشمن کے قدم کسی مقام پر بھی ٹک نہیں رہے تھے کہ اتنے میں ان کے کان میں آواز پہنچی کہ لاہور سیکٹر میں آدمیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے آگے بڑھنے سے رک جاؤ اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں سپاہی اُدھر منتقل کر دو۔

جو سپاہی ہم سے یہ حالات بیان کر رہا تھا، یہاں آکر اس کی آواز بھرّا سی گئی۔ اس نے کہا کہ اگر اُدھر کی ضرورت اس قدر شدید نہ ہوتی تو ہم دوسری صبح تک فیروز پور ہوتے! چنانچہ ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ یہ مدافعانہ پوزیشن لے کر بیٹھ جاتے۔

ہماری جیپ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی ـــــ یہ علاقہ زمین کی زرخیزی اور چراگاہوں کی سرسبزی کے لئے بڑا مشہور ہے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ کپاس کی خشک چھڑیاں تا بحدِ نگاہ کھیتوں میں کھڑی

تھیں۔ معلوم ہوا کہ کپاس چن لی گئی ہے اور چھڑیاں کسی نے نہیں کاٹیں۔ اگر اس دوران میں انہیں پانی مل جاتا تو یہ دو تین مرتبہ فصل دیتیں۔ لیکن جن ہندو نے ہمارا وہ پانی بھی روک لیا تھا جسے وہ معاہدہ کی رو سے دینے کا پابند تھا، وہ اس علاقہ کے لئے پانی کس طرح دے دیتا۔ اس لئے اب یہ سارا علاقہ خشک اور ویران ہو رہا ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ سامنے ایک بہت بڑا گاؤں آیا ——— زرخیز علاقوں کے گاؤں بھی اچھے خاصے قصبے ہوتے ہیں۔ پختہ مکانات۔ بڑے بڑے احاطے، کنال دو کنال کے۔ میں نے پوچھا کہ یہ گاؤں بھی ۸/۷ ستمبر کو فتح ہوا تھا؟ جواب ملا کہ نہیں۔ جب ہم نے مدافعانہ پوزیشن لی ہے تو اس کے بعد ہندوؤں نے تین بار حملہ کیا کہ اپنے چھنے ہوئے علاقہ کو واپس لے لیں لیکن ہر حملہ کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا چھنا ہوا علاقہ انہیں واپس ملنا تو ایک طرف، وہ جس گاؤں سے ہم پر حملہ کرتے تھے وہ گاؤں بھی ان کے قبضہ سے چھن جاتا تھا۔ چنانچہ یہ گاؤں ہمارے قبضہ میں بعد میں آیا تھا۔

پاکستان کے جسور و غیور سپاہیو! تم پر خدا کے سحاب کرم کی بارشیں ہوں۔ معلوم نہیں تمہارے بازوؤں میں کس قسم کی ہمت اور تمہارے سینوں میں کس انداز کے دل ہیں جو ایسے نامساعد حالات میں یہ کچھ کر کے دکھا دیتے ہو!

ہم اسی طرح جیپ میں آگے بڑھتے گئے ——— یہ گاؤں چشتی محمد علی ہے۔ یہ بیری والا۔ یہ جھنگڑ، یہ بگو شاہ، یہ چنتڑ والا، جہاں گورکھا فوج کا دال بھات بکھرا پڑا تھا۔ یہ تو تھے گاؤں۔ اور ہر دو چار گاؤں کے درمیان، ایک ملٹری پوسٹ تھی ——— دوسرے علاقوں میں جو ملٹری پوسٹس ہم نے دیکھیں وہ بس ایسی ہی تھیں جیسے مکی کے کھیت میں مچان کھڑا ہو لیکن یہاں کی ملٹری پوسٹس بالکل قلعہ نما تھیں۔ دس دس فٹ کے اونچے حفاظتی بندھ کے اندر، پختہ کنکریٹ کی نہایت مضبوط عمارت جو توپوں کے گولوں کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اور ہر عمارت کے ساتھ بلند مینار جو دور دور تک پاسبانی کا کام دے۔ ان کی اس قسم کی پوسٹس سارے علاقے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس سے اس امر کا اندازہ لگ سکتا تھا کہ بھارت کب سے ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہا تھا اور ان تیاریوں کا معیار کیا تھا۔ ہم نے ان پوسٹوں کو جا کر دیکھا۔ انہیں فتح کرنا آسان کام نہیں تھا۔ صادقیہ پوسٹ، جھنگڑ پوسٹ، کھوکھر پوسٹ، اہار ستھان پوسٹ، سوار والی پوسٹ، خان علی والا پوسٹ ——— ان کے علاوہ، دریا کے اس پار بھی چار پانچ پوسٹس ہمارے قبضہ میں ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر مضبوط۔ اب یہ تمام پوسٹیں مسمار ہو چکی ہیں اور سامنے کھلا میدان ہے۔ جہاں دشمن بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ فائر بندی کے بعد ان کی طرف سے کوئی شرارت تو نہیں ہوئی؟ اس پر ہمارا میزبان مسکرایا اور کہا کہ آپ شرارت کا کہہ رہے ہیں یہاں سب سے بڑی لڑائی فائر بندی کے بعد ہوئی ہے۔

"سب سے بڑی لڑائی فائر بندی کے بعد"۔۔۔ یہ کیسے؟

انہوں نے کہا کہ جب ۲۳ ستمبر کو فائر بندی کا حکم ملا تو ہمیں قدرے اطمینان ہوا۔ اور ہم نے جوتوں کے تسمے کھول لے۔ لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ۲۶/۲۵ ستمبر کی درمیانی شب، دشمن پورے ساز و سامان کے ساتھ حملہ آور ہو گیا ——— بالکل اچانک ——— ہر قول و قرار کے خلاف، اچانک!

میں نے مضطربانہ انداز سے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ ——— کہنے لگے کہ دشمن کی دو کمپنیاں ختم ہوئیں، کچھ قید ہو گئے۔ اور یہ علاقہ ہمارے قبضہ میں آگیا۔ اس محاذ پر مقابلہ میں گورکھا سپاہی تھے جو بڑے جنگجو اور آہنی پیکر شمار کئے جاتے ہیں اور یہ گورکھے وہ تھے جو قسمیں اٹھا کر آئے تھے کہ ہم اپنی شکست کا بدلہ لیں گے۔

کیا بات ہے ہمارے جانباز مجاہدوں کی ———!

ہم قریب سو میل کا چکر لگا چکے تھے۔ دھوپ سخت تھی، دوپہر ہو چکی تھی کہ جیپ اس سمت کی طرف مڑی جدھر ہم نے دوپہر کا کھانا کھانا تھا۔ راستے میں ایک ریلوے اسٹیشن آیا جہاں فاضلکا کی سمت کی پٹڑی اکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کونسا اسٹیشن ہے۔ جواب ملا ——— امروکا ——— جو پہلے دہلی، کراچی ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن تھا لیکن اب پاکستان کا پہلا اسٹیشن ہے۔

۱۹۴۷ء کی جنگ!

"امروکا" کا نام سن کر میرا ذہن مجھے ایک ثانیہ میں اٹھارہ برس پیچھے لے گیا۔ اور پاکستان اور بھارت کی پہلی لڑائی کے مناظر ایک ایک کر کے میرے سامنے آتے گئے۔ یہ داستان بھی سنانے کے قابل ہے ——— اس لئے کہ اس کے بعد ان داستانوں کے سنانے والے نہیں رہیں گے۔ اور چونکہ (ہماری غفلت سے) یہ داستانیں کہیں محفوظ نہیں کی گئیں اس لئے آنے والی نسلیں ان سے باخبر تک نہیں ہوں گی۔ یہ بات ہے اگست ۱۹۴۷ء کی۔

تقسیم ہند کے بعد، مرکزی حکومت کے پاکستانی عملہ اور ریکارڈ کو دہلی سے کراچی منتقل کرنے کے لئے اسی ریلوے لائن کا راستہ تجویز کیا گیا تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ (اور چند دیگر محکموں) کا عملہ اس ٹرین سے کراچی آنے والا تھا، جسے دہلی سے ۱۲ اگست کو روانہ ہونا تھا۔ میرے رفیقِ عزیز، صدیق ... دعم خوار، فضل محمد سبحانی (مرحوم) میرے ہم سفر تھے ——— فضل محمد سبحانی، جسے آج بھی مرحوم کہتے ہوئے دل پر تیر سا لگتا ہے۔ ۱۱ کی شام، اس محکمہ کے ایک ذمہ دار افسر، جو اس نقل مکانی کے امور سرانجام دے رہے تھے، میرے پاس آئے اور رازدارانہ انداز سے کہا کہ کل جو پاکستانی ٹرین یہاں سے روانہ ہوئی تھی، فاضلکا کے قریب اس پر بم پڑا ہے۔ اب جو ٹرین روانہ ہونے والی ہے، معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔ آپ اس ٹرین سے نہ جائیے۔ پرسوں سے گاڑیاں، لدھیانہ۔ جالندھر۔ لاہور کے راستے چلیں گی۔ آپ اس ٹرین سے جائیے۔ میں نے فوراً سبحانی صاحب مرحوم کو بلایا اور کیفیت بیان کرنے کے بعد کہا کہ کل کا جانا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب پرسوں کی گاڑی سے چلیں گے۔

اس (مرحوم) دوست نے ساری عمر یہ مسلک رکھا تھا کہ ——— "ہمیں تو خوش ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے" ——— اس نے کبھی (اعتراض تو ایک طرف) یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ ایسا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ نہیں ——— ایسا نہیں ہوگا ——— ہمیں کل ہی جانا ہوگا۔ میں نے اسے ہزار سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ حتیٰ کہ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ آپ میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیجئے۔ میں تو کل ہی جاؤں گا۔ اس کے بعد میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں ایسے دوست کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم ۱۲ اگست کی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر احباب نے پرنم آنکھوں

سے ہمیں الوداع کہا۔ شام کے قریب گاڑی جنید کے اسٹیشن پر جو آئی، تو آگے چلنے کا نام نہیں لیتی۔ ڈرائیور... سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ ہمیں جو انجن دیا گیا ہے اس کی ہیڈ لائٹ کام نہیں دے رہی اس لئے اندھیرے میں کیسے آگے چلا جائے۔

یہ تمام علاقہ سکھوں کی ریاستوں پر مشتمل تھا اور امن کے زمانے میں بھی مخدوش سمجھا جاتا تھا۔ ڈرائیور سے جو یہ سنا تو موت سامنے دکھائی دینے لگی۔ ہم مجبور اور بے بس وہاں کھڑے تھے اور چاروں طرف وحشت و بربریت کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا ہوگا کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مال گاڑی وہاں آکر رکی۔ اس کا ڈرائیور بھی حسنِ اتفاق سے مسلمان تھا۔ اس نے جب یہ ماجرا سنا تو اپنے انجن کی ہیڈ لائٹ یہ کہہ کر ہمیں دے دی کہ آپ کی جانیں زیادہ قیمتی ہیں۔ آپ حفاظت سے جائیے۔ مجھ پر جو بیتے گی بھگت لوں گا۔

اس زمانے کا مسلمان عملہ وفا شعاری اور جاں نثاری کا جو جذبہ لے کر آیا تھا، اسے اگر کہیں اپنی مستقل متاع بنا لیا جاتا تو نہ معلوم آج ہم کن بلندیوں پر ہوتے۔

گاڑی آگے چلی لیکن بڑی سست رفتاری سے! ڈرائیور سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ نیچے سے جو کوئلہ نکلا ہے وہ بڑا ناقص اور بھیگا ہوا ہے۔ اس لئے گاڑی کی رفتار تیز نہیں ہو رہی!

آپ دیکھتے ہیں کہ عین تقسیم ملک کے وقت، ہندو نے پاکستان کے خلاف کس قسم کی جنگ چھیڑ رکھی تھی!۔

گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ہمارے سینوں میں دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ جوں جوں فاضلکا قریب آرہا تھا ہمارا خون خشک ہو رہا تھا کہ نہ معلوم ٹرین کے ساتھ کیا بیتے!۔ آخر شب گاڑی فاضلکا پر رکی تو دور سے "بندے ماترم"۔ "مہابیر ارجن کی جے" کے نعرے سنائی دیئے۔ ہم گاڑی میں سہمے بیٹھے تھے۔ نعروں کی آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی جلدی چلا دو۔ اس نے کہا کہ گاڑی کیسے چلاؤں لائن کلیر نہیں دے رہے۔

نعرے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ سبحانی مرحوم میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جس قسم کے جذبات جھلک رہے تھے۔ ان کی یاد میں آج تک نہیں بھول سکا —— اپنی نہیں، میری حفاظت کی طرف سے پریشانی —— اپنے فیصلہ پر ندامت —— اور اس کے ساتھ ہر قربانی پر آمادگی —— میں نے کہا گھبراؤ نہیں —— میرے پاس (تکلیر مارنے والی) بندوق تھی —— بچے سو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں ٹرین کے باقی ساتھیوں کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ یہ بندوق لے لو۔ اگر خطرہ کا وقت آگیا تو اس سے بچوں کو ختم کر دینا۔ اس کے بعد ہم اطمینان کی موت مر سکیں گے۔ نعرے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ جب ان کی آوازیں بہت ہی قریب آگئیں تو یکایک ہماری گاڑی سرکی اور چل پڑی —— معلوم نہیں کہ یہ لائن کلیر لے کر ہوا، یا اس کے بغیر ہی۔ تھوڑی دور آگے آئے تو دور سے مؤذن کی آواز کانوں میں پڑی —— اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اَللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ —— اس آواز نے ہمارے عروق

افسردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ یہ تھی ـــــ وہ اذاں جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ـــــ معلوم ہوا کہ اب ہم سرحدِ پاکستان میں ہیں۔ یہ "امروکا" کا اسٹیشن تھا۔

آج ـــــ میں اٹھارہ برس اور چھ ماہ کے بعد، اسی امروکا کے اسٹیشن کے پاس ریلوے لائن پر کھڑا تھا ـــــ یہ ٹرین صحیح و سلامت، بخیر و خوبی، کراچی پہنچ گئی۔ اور وہ گاڑی جو ۱۳ اگست کو دہلی سے کراچی کے لئے دوسرے راستے روانہ ہوئی تھی ـــــ لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، میں اس پر کیا گزری ـــــ اس کا اجرا وہ لاشیں سناتی تھیں جو لاہور پہنچنے پر اس کے ڈبوں سے نکالی گئی تھیں۔ ہماری ٹرین وہ آخری گاڑی تھی جو صحیح و سلامت کراچی پہنچی۔

اس کے بعد ـــــ ستیجانی (مرحوم) ہمیشہ فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا کرتا ـــــ بعض اتفاقات کس قدر تحیر انگیز ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی ـــــ اتفاق (چانس) تو کہنے ہی اسے ہیں جس کی توجیہہ سمجھ میں نہ آئے۔

یہ تھا وہ ہندو، جس نے ہمارے ساتھ اگست ۱۹۴۷ء سے یہ کچھ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دھماکا تو اس آتشِ خاموش کی ایک کڑی تھی۔

میں اٹھارہ برس پہلے کے انہی تصوّرات میں گم تھا کہ ہماری جیپ امروکا کے رسٹ ہاؤس میں پہنچ گئی جہاں ہم اپنے نہایت مخلص میزبان کے حسنِ تواضع سے لذّت یاب ہوئے ـــــ اس کے بعد ہم نے قریب پچاس میل اور جیپ میں سفر کیا اور اس علاقہ کے نشیب و فراز کا معائنہ اور مطالعہ کرتے ہوئے قریب سات بجے شام، واپسی کے لئے گاڑی میں سوار ہو گئے۔

اس وقت جبکہ میں اپنے ان تاثرات کو قلم بند کر رہا ہوں، رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اگر فاضلکا سیکٹر کے وہ شکوے مجھ تک نہ پہنچتے جن کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے، تو میں اس محاذ کی معرکہ آرائیوں کی ان داستانوں سے محروم رہ جاتا جنہوں نے پاکستان کی تاریخ میں ایک زرّیں باب کا اضافہ کیا ہے۔

فاضلکا سیکٹر کی فوجی کمان کے افسرو! پاکستان کی آنے والی نسلیں آپ کے اس عزیمانہ فیصلہ کا ہزار دل سے احترام کریں گی۔ جس نے ہماری تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔

اور اس سیکٹر کی فوج کے جانباز مجاہدو! آپ کی بے مثال جرأت و بسالت پر قوم ہمیشہ فخر کرے گی جس نے اس حقیقت کو بے نقاب کر کے دکھا دیا کہ:۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

آپ کے بھائیوں کی کروڑوں محبت بھری آنکھیں آپ کو سلام کہتی ہیں!

پرویز

میں نے چھمب جوڑیاں میں کیا دیکھا؟

عزیزہ بیٹی، سلمٰی پرویز، جو اس زمانے میں انٹرمیجیٹ کی طالبہ تھی، اپنے بابا کے تتبع میں، ان زیارت گاہوں کی سیاحت کے لئے گئی اور اپنے تاثرات حسبِ ذیل الفاظ میں قلم بند کئے جو طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئے تھے۔

جب سے بابا جی چھمب جوڑیاں سے واپس آئے، وہ اکثر ہمیں وہاں کی باتیں سناتے رہتے جوں جوں وہ باتیں سناتے، چھمب جوڑیاں دیکھنے کا شوق بڑھتا جاتا۔ شوق کی اس شدت نے ارادے کی شکل اختیار کر لی اور ارادے کی پختگی ایک دن عمل بن گئی۔ چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۶۶ء کی صبح تاروں کی چھاؤں میں، ہمارا قافلہ اس طرف روانہ ہو گیا۔ یہ قافلہ جو قریب قریب بیس افراد پر مشتمل تھا۔ (بظاہر) بڑا اَن میل اور بے جوڑ سا تھا ـــــ اس میں ہم بچیاں بھی تھیں، اور ہمارے ساتھ ہماری مائیں، خالائیں اور پھوپھیاں بھی۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ جب مقصد ایک ہو اور جذبات یکساں، تو عمروں کے فاصلے بہت سمٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ سارا سفر بڑی ہی باتمیز بے تکلفی میں کٹا۔

ہمارا قافلہ بارہ بجے کے قریب چھمب کی اس عمارت کے سامنے تھا جو پہلے بچوں کا اسکول تھا اور اب فوجی بھائیوں کا ہسپتال ہے۔ ہسپتال کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اتنے مختصر سے سامان کے ساتھ، ایسے وسیع پیمانے پر زخمیوں اور بیماروں کا علاج کیسے ہوتا ہوگا لیکن ہمیں بتایا گیا کہ فوج کے قابل ڈاکٹر اسی سامان (یا بے سروسامانی) سے بڑے سے بڑے اپریشن کر دیتے ہیں۔ فوجیوں کی ہر ادا نرالی ہوتی ہے۔

ہسپتال میں ایک سپاہی بستر پر لیٹا تھا جس کا ہاتھ زخمی تھا ـــــ اس کی عمر کے متعلق بس یوں کہئے کہ اس کا ایک پاؤں جوانی کے ساحل پر اور دوسرا ابھی تک لڑکپن کے ـــ

"کیڈٹ کالج کا ڈھیر" ہی تھا۔ ہم نے اپنے فوجی گائیڈ سے پوچھا کہ اب تو لڑائی نہیں ہو رہی، اس سپاہی کا ہاتھ زخمی کیسے ہوگیا؟ ہمارے اس سوال پر اس زخمی سپاہی کے چہرے پر کچھ اس قسم کی شرمیلی تمتماہٹ پیدا ہوئی جس کی وجہ...... ہم قطعاً نہ سمجھ سکے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس سے اپنی رائفل صاف کرتے ہوئے گولی چل گئی تھی۔ اور یوں اس کا ہاتھ زخمی ہوگیا —— ہم نے جب پھر اس زخمی کی طرف نگاہ کی تو وہ ندامت کے مارے چادر میں منہ لپیٹ چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جو نوجوان اپنی غلطی کا اس طرح اعتراف کرتا ہے اور اسے احساسِ ندامت اس شدت کا ہے وہ اپنی ڈیوٹی کس دیانتداری سے دیتا ہوگا؟ سپاہی کی جگہ اگر فلسفی ہوتا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ کسی طرح الزام رائفل کے سر تھوپ دیا جائے۔

تھوڑی دور آگے جاکر ہم نے ہندؤں کے مورچے دیکھے۔ وہ بمشکل ایک ایک فٹ چوڑے تھے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کے سورما سپاہی کس تن و توش کے مالک ہوں گے! بھوکوں مرنے والی قوم کے سپاہیوں کا جسم اس سے زیادہ چوڑا کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ان کا پیچھے چھوڑا ہوا ایک جوتا پڑا ہے۔ اس سے مجھے "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی" یاد آگئی۔ ایک جگہ ایک ٹوٹے ہوئے ٹینک کے قریب کچھ اوزار پڑے تھے۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کوئی "بہادر نوجوان" ٹینک مرمت کر رہا ہوگا۔ بھگدڑ جو مچی تو نہ ٹینک کی سدھ بدھ رہی، نہ اپنے اوزاروں کی۔ اپنی جان کی فکر پڑی اور اُٹھ بھاگا۔

ہم نے دیکھا کہ ہندؤں کے مندر ہر جگہ صحیح سلامت حالت میں کھڑے تھے۔ ہم نے فوجی بھائیوں سے پوچھا کہ جب ہندؤں نے ہماری مسجدوں کو شہید کردیا ہے تو آپ نے ان کے مندروں کو کیوں نہیں تباہ کیا؟ سنیئے کہ انہوں نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگے کہ ہمارے خدا کا حکم ہے کہ کسی قوم کی پرستش گاہ کو مت تباہ کرو۔ اس لئے ہم انہیں کس طرح منہدم کرسکتے تھے۔؟

یہ جواب ایک ان پڑھ سپاہی کی زبان سے سُن کر ہمیں اپنے سوال پر ندامت ہوئی اور بے ساختہ زبان سے نکلا کہ اے کاش! ہمیں اپنے اسکولوں میں کوئی اسلام کی اتنی سی بات ہی بتانے والا ہو۔

اسی طرح ہم نے ایک اور اسکول کی عمارت کو صحیح و سلامت دیکھ کر ان سے پوچھا کہ آپ نے اس عمارت کو کیوں محفوظ رکھ چھوڑا ہے؟ جواب ملا کہ اس لئے کہ اُن کے بچے آئیں گے تو پڑھیں گے کہاں؟ ہم نے کہا کہ آپ کو ان کے بچوں سے کیا واسطہ؟ کہنے لگے کہ اس جنگ میں بچوں کا کیا قصور تھا۔ انہوں نے جنگ نہیں لڑی۔ اس لئے انہیں اس کی سزا کیوں ملے؟ ان کی تعلیم میں حرج نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سن کر ہم خفیف تو بہت ہوئے لیکن ہم میں ایک فلسفہ کی اسٹوڈنٹ بھی تھی۔ اس نے کہا کہ یہی بچے تو بڑے ہوکر ہمارے ساتھ جنگ کریں گے۔ اور سپاہی

نے جواب دیا کہ اتنے میں ہمارے بچے بھی جوان ہو جائیں گے ——— آپ اِس کی فکر نہ کریں۔

جوڑیاں کا قصبہ بالکل ویرانہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کی دکانوں اور مکانوں میں بڑا قیمتی سامان تھا۔ ہم نے سپاہیوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے بھی اس میں سے کچھ اپنے لئے رکھا ہے؟

انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کا سپاہی بھی غنیمت کا مال لوٹنے لگے تو پھر اس میں اور ڈاکو میں فرق کیا ہے؟ ——— ان کے اس جواب سے بڑے تو ایک طرف، ہم بچیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ دل نے کہا کہ:-

یہ ہے ہماری فوج کی حیرت انگیز کامیابی کا راز!

جوڑیاں کی مسجد میں پہنچے تو اگرچہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس سعادت سے محروم نہ رہنا چاہا اور مسجد میں نفل پڑھے۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے کہا کہ آپ پہلی عورتیں ہیں جنہوں نے یہاں آکر نماز پڑھی ہے۔

اس مسجد کو سپاہیوں نے دلہن بنا رکھا ہے۔ ہم نے کہا کہ اگر ہمیں چھمب جوڑیاں کا علاقہ چھوڑنا پڑا تو ہندو اس مسجد کو پھر خراب کر دیں گے۔ کہنے لگے کہ وہ خراب کر دیں گے تو ہم پھر آکر اسے درست کر لیں گے۔ اس قوم پر خدا کا عذاب اسی لئے تو آتا ہے کہ وہ اس کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرتی ہے۔ وہ جب بھی ایسا کرے گی اس پر اسی طرح خدا کا عذاب نازل ہو جائے گا جس طرح پچھلی جنگ میں ان پر عذاب نازل ہوا تھا ——— ایمان بھی انسان کے اندر کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے!

ہم نے ہوائی جہازوں کو گرانے والی ایک توپ کے قریب ایک مسکین صورت سے فوجی بھائی کو دیکھا۔ ہمارے گائیڈ نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے! ——— یہ وہ بہادر جوان ہے جس نے اس توپ سے دشمن کے کئی ہوائی جہاز گرائے تھے اور جس کی وجہ سے اسے ہلالِ جرأت کا امتیازی نشان ملا ہے ——— وہ یہ کہہ رہا تھا، اور نوجوان خاموش کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی لیکن اس کا سر نیچے جھک رہا تھا ——— کس قدر بے ساختہ تھا بارگاہِ خداوندی میں اس کا یہ سجدۂ شکرانہ ——— وہ سجدہ جس پر ہماری دکھاوے کی ہزاروں نمازیں قربان ہوں۔

ٹیس میں ہم نے ایک میجر سے پوچھا کہ جب آپ لوگ جنگ کی اگلی صفوں میں ہوتے تھے تو آپ کو کیسے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی فتح ہو رہی ہے یا پسپائی! اس نے ہنس کر کہا کہ جب ہمیں گرم گرم اُبلی ہوئی دال ملتی تھی تو ہم سمجھ لیتے تھے کہ ہماری فتح ہوئی ہے۔ اِس پر سارا کمرہ قہقہہ سے گونج اٹھا ——— لیکن میرے خیال میں میجر صاحب ہنسی ہی ہنسی میں وہ

بات کہہ گئے تھے جس میں جنگ کی شدت اور سپاہی کی بلند ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے لئے بڑا ہی وافر سامان تھا ــــــ سپاہی کی خوشی اور غم کے پیمانے ہم سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں !

ایک جگہ ہمیں پیاس لگی۔ جو پانی سامنے آیا وہ ذرا گدلا تھا۔ پینے کو جی نہ چاہا۔ تو ایک صوبیدار صاحب نے کہا کہ بیٹیو! ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی صاف پانی منگواتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ آپ پانی منگوایئے نہیں۔ ہمیں جگہ بتا دیجئے۔ ہم خود جا کر پی لیں گی۔ کہا کہ تم وہاں کیسے جاؤ گی۔ وہ جگہ تو یہاں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے۔! ــــــ اللہ اکبر! وہ ہماری خاطر پانچ چھ میل کے فاصلہ سے پانی منگا رہے تھے۔ نہ ہوا لاہور کا "مہذب شہر" جو اس قسم کی ہچکچاہٹ پر جھٹ سے جواب ملتا کہ :-

"ایسی ہی نازک مزاجی تھی تو گھر سے باہر تشریف کیوں لائیں۔ پہلے معلوم ہوتا، تو آپ کے لئے کوکا کولا کی فیکٹری لگوا دیتے"۔

ہم نے اس سے پہلے سپاہیوں کو کبھی نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھا تھا یا لوگوں سے سن رکھا تھا اس سے دل پر اس قسم کے تاثرات تھے کہ سپاہی بڑے وحشی، غیر مہذب، اکھڑ، تُند خو، بدمزاج ہوتے ہیں۔ لیکن اس دن جو سپاہیوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ ملا تو معلوم ہوا کہ یہ تو اس سے بالکل الگ قسم کے انسان ہیں۔ ہم دن بھر ان کے ساتھ رہے۔ ان سے کھُل کر باتیں کیں۔ ہنسی مذاق بھی کیا۔ پہاڑوں پر، وادیوں میں، جنگلوں میں ان کے ساتھ رہے۔ خندقوں اور مورچوں تک کی تنہائیوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ۔ ان میں ان کے افسرز بھی تھے اور عام سپاہی بھی۔ اس سارے دوران، کیا مجال کہ ان میں سے کسی کی زبان سے ایک حرف بھی بدتمیزی کا نکلا ہو یا کوئی حرکت یا خفیف سا اشارہ بھی ناشائستگی کا اُبھرا ہو۔ ان میں شگفتگی اور خوش مذاقی بھی تھی، لیکن اس قدر پاکیزہ کہ اس کی آب سُچے موتیوں سے بھی زیادہ شفاف تھی ــــــ ان کے ساتھ ان جنگلوں میں پھرتے وقت ہمیں وہ اطمینان اور سکون نصیب تھا جس سے ہم مہذب بستیوں کے ڈرائینگ روم میں بھی محروم ہوتے ہیں۔

ــــــ میں دن بھر سوچتی رہی کہ ایک یہ دنیا ہے اور ایک وہ دنیا، جس میں ہر صبح، ہم بچیوں کو اسکول یا کالج بھیجنے اور وہاں سے گھر آنے کا مسئلہ ہمارے ماں باپ کے لئے سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔ اور ہم سارا راستہ یوں ڈری، سہمی، چلتی ہیں جیسے ہر قدم پہ کسی سانپ کے ڈسنے یا بھیڑیئے کے جھپٹنے کا خوف ہو ــــــ یہ تأثرات لئے ہم شام کو، واپس لوٹے۔ ہمارے یہ فوجی بھائی! ــــــ جو ہمیں اب فی الحقیقت اپنے باپ اور بھائی نظر آتے تھے ــــــ موٹروں تک ہمارے ساتھ آئے۔ اور نہایت سکون سے خدا حافظ کہہ کر خاموشی سے رخصت ہو گئے ــــــ نہ ستائش کی تمنا نہ شکریہ تک کی آرزو ــــــ ہمیں نے محسوس کیا کہ ہم ان سپاہیوں کے لئے جو تحفے بھیجتے رہے ہیں، ان کے بجائے اگر ہم ان کے پاس

وقتاً فوقتاً بچوں کو بھیجتے تو یہ ان کے لئے زیادہ عزیز تحفہ ہوتا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ یہ بچوں کو بہت (M I S S) کرتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اس علاقہ کے در و دیوار پر بڑے بڑے جلی حروف سے بہت کچھ لکھا ہے۔ کہیں لکھا ہے:۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا!

ایک جگہ لکھا تھا:۔

"مسلمان کا مقابلہ دنیا کا کوئی سپاہی نہیں کر سکتا"۔

کہیں یہ لکھا تھا:۔

"یاد رکھو! ہم پھر بھی اسے فتح کر سکتے ہیں"۔!

یہ الفاظ ابھر ابھر کر کہہ رہے تھے کہ اس احساس سے کہ ہمیں یہ علاقہ خالی کرنا ہے۔ ان سپاہیوں کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

(۵)

میں نے اپنی اس روئیداد میں اس علاقہ کی خوب صورتی کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ (جیسا کہ ہمیں بتایا گیا) وادیٔ کشمیر اس ..... سے ذرا ہی زیادہ خوبصورت ہے۔ اور اگر یہ واقعہ ہے کہ وادیٔ کشمیر اس علاقہ سے بھی زیادہ حسین ہے تو فطرت اپنے آپ پر ظلم کرے گی اگر اس وادی کو اس قوم (ہندو) کے حوالے کر دے، جس کے متعلق بابر نے کہا تھا کہ:۔

"ذرا ان کی بدذوقی ملاحظہ کیجئے۔ یہ دریا کے کنارے مکانات بناتے ہیں اور ان کی پشت دریا کی طرف رکھتے ہیں!

مجھے یقین ہے کہ فطرت اپنے آپ پر کبھی ایسا ظلم نہیں کرے گی!

(سلیمی پرویز)

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

۶ ستمبر کی صبح دشمن کی توپوں کی گرج نے جو فضا کے پردے چاک کئے ہیں تو ہمارے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں میں ہمیں اپنے آپ کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی تھی، لیکن اس کے بعد ہم اپنی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی خرابی ایسی نہیں تھی جو ہمیں اپنے اندر دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں بعض خرابیاں فی الواقعہ موجود تھیں۔ لیکن ایک مسلسل پروپیگنڈے نے ہمارے اندر ایسا احساسِ کمتری پیدا کر دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دنیا کی ناکارہ ترین قوم ہیں، ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ہمیں پاکستانی کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

اس احساسِ کمتری کو دور کرنے کے لئے قرآن کریم کی راہ نمائی ہمارے سامنے تھی۔ وہ ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا کہ: وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.... (۳/۱۳۸) تم گھبراتے کیوں ہو۔ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھ کر خود اعتمادی پیدا کر لو، تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ ہم سے بار بار کہتا تھا کہ تم اپنی تعداد کی کمی سے مت گھبراؤ۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ (۸/۶۵) اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہوئے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ ہم ان آیات کو پڑھتے اور ان کی تلاوت کا ثواب حاصل کر کے قرآن کو پھر بالائے طاق رکھ دیتے۔ تاریخ میں ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے وہ محیر العقول کارنامے آتے جنہیں ہمارے لئے نمونہ بننا تھا۔ ہم ان کارناموں کو پڑھتے تو اپنی بے عملی اور دوں ہمتی کو اس خود فریبی کے پردے میں چھپا کر آگے بڑھ جاتے.... کہ یہ سب کچھ معجزات اور کرامات کی رو سے ہوا تھا۔ اب وہ معجزے کس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟

ہمارا حکیم الامت ہم سے بار بار کہتا کہ: ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

لیکن ہم اسے ایک شاعر کا سہانا خواب کہہ کر حوالۂ طاؤس و رباب کر دیتے۔ یہ کچھ ہوتا رہا، اور ہم بدستور سوئے رہے۔ لیکن ۶ ستمبر کی صبح توپوں کے ایک ہی دھماکے نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور قوم کے تحت الشعور میں خوابیدہ قوتیں اس طرح ابھر کر سامنے آ گئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، مضراب کی ایک ضرب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ثریا شکار طیاروں کے جانفروش شاہینوں کو دیکھا تو وہ اس حقیقت کی عملی تفسیر تھے کہ: ؎